پوری دنیا میں رونما ہونے والے پراسرار و حیرت انگیز
واقعات جن کی آج تک کوئی توجیہ پیش نہ کی جا سکی۔

حیرت انگیز واقعات



فریک ایڈورڈز

ترجمہ
محمد ابراہیم خان

پوری دنیا میں رونما ہونے والے پراسرار اور حیرت انگیز
واقعات جن کی آج تک کوئی توجیہ پیش نہ کی جا سکی

حیرت انگیز واقعات

مصنف : محمد ابراہیم خان

سٹی بک پوائنٹ
نوید اسکوائر، اردو بازار، نزد مقدس مسجد، کراچی

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت اور معیاری کتاب

بیاد

HASAN-DIN

نام کتاب	:	حیرت انگیز واقعات
مصنف	:	محمد ابراہیم خان
ناشر	:	سٹی بک پوائنٹ، کراچی
اشاعت اول	:	اپریل 2007ء
تعداد	:	500
قیمت	:	100 روپے

ازراہِ تمہید

جو کچھ ہمارے اردگرد موجود ہے اور واضح طور پر دکھائی دینے کے علاوہ سمجھ میں بھی آ رہا ہے اس پر ہم کبھی خاطر خواہ توجہ دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو چیز، اور جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی لگن انسان کی بڑی نفسیاتی خصوصیات میں سے ہے۔ ہر انسان شعوری یا لاشعوری طور پر اس بات کے لئے کوشاں رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ باتیں جاننے اور سمجھنے میں کامیابی سے ہمکنار ہو۔ اس کوشش میں حقیقی کامیابی بہت کم لوگوں کا مقدر بنتی ہے۔ ہم ایک ایسی کائنات کا حصہ ہیں جس میں ہر آن بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے اور ہمیں مسلسل ورطۂ حیرت میں ڈال رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ہر بات کی تہہ تک پہنچیں جو ہماری عقل کو عاجز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ شاید اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ سمجھ میں نہ آنے والی چیزیں ہماری عقل کو چیلنج کرتی ہیں اور فطری طور پر ہماری دلچسپی ہر اس چیز میں ہوتی ہے جو ہماری عقل کو چیلنج کرتی ہو!

ہمارے چاروں طرف ان گنت عجیب و غریب چیزیں بکھری پڑی ہیں اور انہیں دیکھ کر ہم حیران ہوتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح متعدد واقعات اور حقائق ہمیں دریائے حیرت میں غرق کئے رہتے ہیں۔ فرینک ایڈورڈز نے **Stranger Than Science** میں ایسے واقعات جمع کئے ہیں جن کی اصلیت تسلیم کرنے سے ذہن انکار کرتا ہے۔ فرینک ایڈورڈز کو دنیا اڑن طشتریوں کے بارے میں تحقیق کے حوالے سے جانتی ہے۔ دوسرے بہت سے امور پر بھی ان کی تحقیق قابل رشک رہی ہے۔ ایک مقبول ریڈیو شو کے میزبان کی حیثیت سے انہوں نے حیرت انگیز واقعات کے بارے میں مواد جمع کیا اور متعلقہ شخصیات کو اپنے پروگرام میں مدعو کیا تاکہ ان واقعات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ امور کی وضاحت ممکن ہو سکے۔ اس شکل میں دنیا کو **Stranger Than Science** ملی جس میں عجیب و غریب واقعات کو باضابطہ تصدیق کے بعد شامل کیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب کا بنیادی مقصد آپ کو فرصت کے لمحات میں ہلکے پھلکے مطالعے کا موقع فراہم کرنا ہے، مگر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں درج متعدد واقعات آپ کو کچھ نہ کچھ سوچنے پر ضرور مجبور کرینگے۔ اس کتاب کی تلخیص و تدوین میں مجھے محترم احفاظ الرحمٰن، آصف مالک، تنزیل الرحمٰن اور عارف انصاری ایسے مخلص احباب کا تعاون حاصل رہا ہے جس کیلئے میں دل کی گہرائی سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سٹی بک پوائنٹ کے روح رواں آصف حسن لکھنے والوں کو تحریک دینے میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کو عملی شکل دینے میں ان کی دی ہوئی تحریک کا بھی کچھ کم ہاتھ نہیں۔ امید ہے کہ ان کی رفاقت مجھے میسر رہے گی۔

ایم ابراہیم خان

انتساب

والد محترم عبدالشکور خان مرحوم اور والدہ محترمہ شریفہ بی بی کے نام جن کی محبت اب صرف یادوں کی شکل میں رہ گئی ہے، اور یہی سرمایۂ حیات ہے

فہرست

بے چین روحیں

ویسٹ انڈیز کے جزیرے بارباڈوز میں 24 اگست، 1943 کا دن چند عجیب باتیں لے کر آیا۔ اس دن چند مشنریز نے اس جزیرے پر واقع ایک قبرستان میں الیگزینڈر ارون کی قبر کھلوائی۔ ارون اس جزیرے پر فری میسن تحریک کا سرخیل تھا۔ جب اس کی قبر کھولی گئی تو ایک پنڈورا بکس کھل گیا۔ جس قبر میں ارون کو دفن کیا گیا تھا اسی کے اندر ایک بغلی قبر میں، جو دراصل تہ خانے کی ہیئت کی تھی، سر ایوان میک گریگر کو بھی دفنایا گیا تھا۔ ان کی تدفین 1841 میں عمل میں آئی تھی۔ یہ دونوں قبریں ایک کوٹھری نما تہ خانے میں تھیں اور عیسائیوں کے قبرستانوں میں ایسی قبریں نایاب نہیں۔ ان میں مردوں کو دفنانے کی بجائے تابوت میں سجا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ تہ خانے میں سر ایوان میک گریگر کا تابوت ایک بہت بڑے پتھر کو تراش کر بنائے گئے چبوترے پر رکھا گیا تھا۔ کوٹھری کی زمینی سطح سے اس چبوترے کی بلندی چار فیٹ سے زیادہ تھی۔ دونوں تابوتوں کو جس والٹ میں رکھا گیا تھا اس تک لے جانے والے راستے کو اینٹوں سے چن دیا گیا تھا۔ جب مشنریز نے اس والٹ میں جانے کے لئے اینٹوں سے چنی ہوئی دیوار کو گرایا تب اس بات پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ اس دیوار کو عشروں سے نہیں توڑا گیا۔ مگر سر ایوان کا تابوت اپنی جگہ سے کھسک کر اس دیوار سے آ لگا تھا اور جب دیوار کو گرایا گیا تو تابوت ایک جھٹکے سے زمین پر آ رہا۔ تابوت سر کے بل کھڑا تھا۔ وہاں موجود کسی بھی شخص کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ 600 پاؤنڈز وزن کے جس تابوت کو اٹھانے کے لئے کم از کم آٹھ مزدور درکار تھے وہ اپنے والٹ میں ادھر سے ادھر کیسے ہو گیا۔

اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ارون کے تابوت کا تو سراغ ہی نہ ملا۔ ایک تابوت غائب تھا اور دوسرا ملا بھی تو سر کے بل! اس پر ہنگامہ تو برپا ہونا ہی تھا۔ قبرستان کے

نگرانوں اور مقامی حکام کو اس واقعے کی اطلاع دی گئی۔ ماہرین آئے اور انھوں نے ریکارڈز اور قبرستان کے اس والٹ کا جائزہ لیا۔ ریکارڈز کے مطابق سر ایوان میک گریگر کے تابوت کو والٹ کی سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ ایسے میں یہ حقیقت سب کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھی کہ تابوت مخالف سمت کی دیوار کے ساتھ سر کے بل کھڑا تھا! قبر کو کھولنے پر مامور مزدوروں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ وہاں اور کوئی نہیں آیا تھا اور یوں بھی توڑی جانے والی دیوار صاف بتا رہی تھی کہ اسے عشروں پہلے بنایا گیا تھا۔ اس کی مہر بھی درست حالت میں تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اس قبر اور اس کے والٹ کو کسی نے ایک طویل عرصے سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ظاہر ہے ان حقائق کی موجودگی میں یہ بات حیرت انگیز تھی کہ ایک تابوت اپنی جگہ سے بہت دور ملا تھا اور دوسرا غائب تھا۔

بار باڈوز کے ہی ایک اور قبرستان میں چیز (Chase) خاندان کی قبر کا والٹ بھی عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ اس والٹ میں ایک بہت بڑا تابوت ٹامس چیز کا تھا جسے بلا مبالغہ آٹھ افراد بڑی مشکل سے اٹھا پاتے تھے۔ جب بھی کوئی تابوت رکھنے کے لئے والٹ کو کھولا گیا تب وہاں ٹامس چیز کا تابوت الٹی سیدھی حالت میں ملا۔ اور کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر ٹامس چیز کی روح کیوں بے قرار تھی اور تابوت کو اپنی اصل جگہ سے کیوں ہٹنے پر مجبور کرتی تھی؟ اس والٹ میں رکھے جانے والے تابوتوں کو حیرت انگیز طور پر ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہاں، مسز گوڈرڈ اور ان کی پوتی کے تابوت ہمیشہ اسی جگہ ملے جہاں انھیں رکھا گیا تھا۔ ٹامس چیز اور دیگر افراد کے تابوتوں میں ہلچل کیوں ہوتی تھی اور ان کی روحیں کیوں بے چین تھیں، یہ بات کوئی بھی نہ سمجھ پایا۔ آخر کار اس والٹ سے چیز خاندان کے افراد کے تابوت نکال کر کہیں اور رکھے گئے تب انھیں سکون ملا۔

بار باڈوز کے کرائسٹ چرچ قبرستان میں چیز خاندان کا والٹ اب بھی موجود ہے اور اس پر بنا ہوا سوالیہ نشان ان عجیب و غریب واقعات کی یاد دلاتا ہے۔

برمودا تکون: سائنس کی دنیا کیلئے چیلنج

برمودا تکون کا علاقہ کل کی طرح آج بھی پراسرار ہے۔ اس کے بارے میں جو دیو مالائی انداز کی باتیں کہی جاتی ہیں وہ اگرچہ ثابت نہیں ہو سکی ہیں مگر اس کے باوجود سائنس دان آج بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس علاقے میں بہت سے فضائی اور بحری جہاز کیوں غائب ہوئے؟

آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز اس طرح غائب ہو جائے کہ اس کا ڈھونڈنے سے بھی کہیں سراغ نہ ملے؟ آپ سوچیں گے کہ ایسا اب ممکن نہیں۔ اور ایسا سوچنا فطری امر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اب سائنسی طور طریقوں سے کسی بھی چیز کا سراغ پانا قدرے آسان ہو گیا ہے، اور کسی بھی چیز کے اچانک غائب ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر آپ کی سوچ درست نہیں۔ اس لئے کہ جنوب مشرقی امریکا سے متصل سمندری علاقے میں کئی طیارے اور بحری جہاز عملے اور مسافروں کے ساتھ اس طرح غائب ہو چکے ہیں ان کا نام و نشان تک نہیں ملا اور اب بھی اس معاملے پر پراسراریت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس علاقے کو برمودا کی تکون بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے اخبارات اور جرائد میں برمودا کی تکون کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ شاید کسی اور علاقے کی پراسراریت کے بارے میں اتنا نہیں لکھا گیا۔ پائلٹ جب اس علاقے کا نام سنتے ہیں تو ان کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور وہ سوچتے ہیں [illegible] علاقے میں سفر ہی کرنا پڑے تو اچھا!

کہاں تو ذکر ہو رہا تھا کسی چیز کے غائب ہونے [illegible]

ہوئے ہیں اور اس طرح غائب ہوئے ہیں کہ ان کا کہیں کوئی سراغ نہیں مل رہا! اور معاملہ ایسا پراسرار ہے کہ جدید ترین سائنسی تحقیقات کی مدد سے لاکھ کوشش کے باوجود ابھی تک اس حوالے سے کوئی ٹھوس بات نہیں کہی جاسکی ہے۔ جو لوگ ضرورت سے زیادہ ضعیف الاعتقاد ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس علاقے پر بدروحوں کا قبضہ ہے اور وہ اس بات کو پسند نہیں کرتیں کہ وہاں سے کوئی بھی چیز یا کوئی ذی روح گزرے اور اسی لئے وہ ناراض ہو کر طیاروں اور بحری جہازوں کو ان کے عملے اور مسافروں سمیت کسی ایسی دنیا میں لے جاتی ہیں جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ آپ شاید اس بات کو محض بکواس قرار دیں مگر حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بدروحوں اور ان کی جانب سے ایسی ''کارروائیوں'' پر یقین رکھتے ہیں۔ بدروحوں کے تصور کے برعکس بہت سوں کا خیال ہے کہ اس خطے میں سمندر کے اندر کوئی مقناطیسی میدان ہے جو اس طرف سے گزرنے والی ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ تاہم یہ بس محض قیاس آرائیاں ہیں۔ متعلقہ دلائل بہت کمزور ہیں۔

29 جنوری، **1948** کا دن برطانوی مسافر بردار طیارے ''اسٹار ٹائگر'' کے لئے تباہی لے کر آیا۔ رات ساڑھے دس بجے اس طیارے نے اڑان بھری اور برمودا سے **400** میل دور اس نے یہ پیغام دیا کہ سب کچھ ٹھیک ہے اور لینڈنگ مقررہ وقت پر ہوگی۔ اگر یہ پیغام نہ دیا گیا ہوتا تو ضرور حیرت ہوتی۔ جہاز میں سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ اس میں **26** مسافر سوار تھے۔ اس کی منزل کنگسٹن (جمیکا) تھی۔ چار انجنوں والے اس جہاز کی کارکردگی معیاری رہی تھی۔ مگر جہاز سے ملنے والا وہ پیغام آخری تھا۔ انتہائی پراسرار حالات میں جہاز ایسا غائب ہوا کہ اس کا نام ونشان بھی نہ ملا۔ سمندر کی سطح پر ایندھن کے آثار تلاش کرنے کی کوششیں بھی بے سود ثابت ہوئیں۔ اس واقعے نے شہری ہوابازی کی دنیا میں کھلبلی مچادی۔ بہت کوشش کرنے پر بھی یہ معمہ حل نہ ہوا کہ آخر اس جہاز کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

17 جنوری، **1949** کو پھر ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ اس بار ایریل نامی طیارہ ہدف بنا۔ صبح پونے آٹھ بجے اس کے کپتان جے سی میکفین نے ریڈیو پر پیغام دیا کہ ''موسم اچھا ہے اور

کہیں کوئی گڑبڑ نہیں۔ لینڈنگ نارمل ہوگی۔'' پرواز برمودا سے شروع ہوئی تھی اور جمیکا میں اس کی منزل کنگسٹن تھی۔ یہ علاقہ برمودا کی تکون سے بہت قریب ہے۔ اور اسی لیے ہوابازی کے حوالے اسے حساس علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جے سی میکفین نے جو پیغام دیا وہ کسی بھی خطرے کی نشاندہی نہیں کرتا تھا۔ مگر یہ اس کا آخری باضابطہ پیغام تھا۔ اس کے بعد ریڈیو سیٹ پر خاموشی چھا گئی۔ یوں اچانک کسی طیارے کے ریڈیو سیٹ کا خاموش ہوجانا سب کے لئے حیرت اور تشویش کا باعث تھا۔ اچھی خاصی کوششیں کرنے پر بھی جہاز کا کوئی سراغ نہ ملا اور پھر ایک مشکل یہ بھی تھی کہ جہاز راڈار پر بھی نہیں تھا۔ فضا میں ہوتا تو راڈار پر بھی ہوتا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر جہاز کے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ ایمرجنسی کا کوئی پیغام بھیجنے کی بھی مہلت نہ مل سکی! اس مرتبہ بھی جہاز ملا نہ اس پر سوار کسی بھی شخص کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکا۔ یہ جہاز کسی بھی اعتبار سے ایسا نہیں تھا کہ کسی تکنیکی بنیاد پر حادثے کے امکان کے بارے میں سوچا جاتا۔ انجن میں کہیں کوئی خرابی نہیں تھی۔ اور روانگی کے وقت ریڈیو سیٹ سمیت اس کے تمام آلات بالکل درست ڈھنگ سے کام کررہے تھے۔

ان دونوں واقعات نے برمودا کے حوالے سے طرح طرح کی کہانیوں کو نئی زندگی عطا کی۔ نئی زندگی اس لیے کہ چار سال قبل بھی امریکا کے پانچ طیارے ایک ساتھ غائب ہوئے تھے اور ان کا نام ونشان تلاش کرنے کی کوشش بے سود رہی تھی۔

5 دسمبر، **1945** کا دن امریکی فوج کے لئے آج بھی ایک سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں بھی ٹیکنالوجی کے ترقی کے لحاظ سے امریکا باقی دنیا سے بہت آگے تھا اور اسی لئے ہر معاملے میں اسے ایک رول ماڈل یا مثال کی حیثیت حاصل تھی۔ طیارہ سازی کی صنعت میں بھی امریکا سب سے آگے تھا اور لڑاکا طیاروں کی تیاری کے معاملے میں غیر معمولی برتری کا حامل تھا۔

اس دن فورٹ لاڈرڈیل، فلوریڈا میں واقع امریکی بحری اڈے سے پانچ طیاروں نے معمول کی تربیتی پروازیں شروع کیں اور پھر وہ پروازیں مکمل نہ ہوسکیں۔ ان طیاروں کا روٹ

ایسا لمبا چوڑا نہیں تھا کہ کسی خرابی کے بارے میں سوچا جاتا۔ ہر طیارے کو 250 میل کے علاقے میں اپنی پرواز مکمل کرنی تھی۔ تمام پروازیں تکونی تھیں۔ مشرق کی سمت جا کر وہاں سے شمال کا رخ کرنا تھا اور اس کے بعد جنوب مغرب کی سمت سے واپس آنا تھا۔ ٹی بی ایم ٹارپیڈو بومبرز کو اڑانے والے تمام افراد خاصے تجربہ کار تھے اس لیے ان کی مہارت پر شک کرنے کی تو کوئی گنجائش سرے سے تھی ہی نہیں۔ ان طیاروں میں اس دور کے تمام جدید ترین آلات نصب تھے۔ تکنیکی اعتبار سے تمام جہاز غیر معمولی استعداد کے حامل تھے۔ ایک طیارے میں دو ہوا باز سوار تھے جبکہ دیگر طیاروں میں تین، تین افراد سوار تھے۔ پہلے طیارے نے دن کے دو بج کر دو منٹ پر زمین کو الوداع کہی اور اس کے چند ہی لمحوں کے بعد پانچوں طیارے فضا میں تھے۔ ان کی اوسط رفتار 200 میل فی گھنٹہ تھی۔ تین بج کر پینتالیس منٹ پر انھیں واپس آنا تھا مگر عین واپسی کے لمحات میں ایک طیارے کے فلائٹ کمانڈر کا پیغام ملا کہ ''کوئی گڑبڑ ہے، ہمیں زمین دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم کہاں ہیں، ہماری پوزیشن کیا ہے؟ اور بادل بھی چھائے ہوئے نہیں ہیں کہ ہمیں یہ اطمینان ہو کہ بادلوں کے باعث کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔''

ایک اور واقعہ بلکہ کمال یہ ہوا کہ پانچوں طیاروں کے نیوی گیٹرز کو بیک وقت سمت کھو دینے کا احساس ہوا۔ یہ اس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ بعد میں ماہرین اس پر غور کرتے رہ گئے۔

زمین پر فلائٹ کنٹرول ٹاور کے عملے کے لئے یہ سب بہت پریشان کن تھا۔ فضا میں کوئی ایک طیارہ گم نام نہیں ہوا تھا بلکہ پانچ طیارے تھے۔ اگلے پندرہ منٹ خاموشی میں گزرے۔ اس خاموشی نے سب کے اعصاب میں ٹوٹ پھوٹ پیدا کر دی۔ انھوں نے اس بات کا جائزہ لینا شروع کیا کہ کہیں خود ان کے آلات میں تو کوئی خرابی نہیں۔ ابھی یہ کام جاری ہی تھا کہ ریڈیو پر آخری بار ایک فلائٹ کمانڈر کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ''ہمیں معلوم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔'' اس وقت یہ لوگ اپنے base سے شمال مشرق کی سمت 225 کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ کمانڈر نے کہا: ''ایسا لگتا ہے جیسے ہم......'' اور پھر اس کی بات ادھوری ہی رہ

گئی۔ کسی کو اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ پیغام ایسا نہیں تھا کہ جس کی مدد سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی مگر پھر بھی یہ بات بہت اہم تھی کہ اس بات کو بدنصیب افراد میں سے کوئی بیان کر رہا تھا۔

جب پانچوں طیارے مقررہ وقت پر واپس نہیں آئے تو ان کی تلاش میں ایک فلائنگ بوٹ کو روانہ کیا گیا مگر وہ فلائنگ بوٹ بھی پانچ منٹ میں لاپتا ہو گئی۔ اس میں 13 افراد سوار تھے۔ کوسٹ گارڈز کے جہازوں نے پوری ساحلی پٹی کو رات بھر کھنگالا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ صبح ہوتے تک طیارہ بردار جہاز سولومنز بھی اس کام میں شریک ہو گیا۔ مجموعی طور پر 300 جہازوں اور طیاروں نے بدنصیب طیاروں کے ملبے اور بچ جانے والوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ نہ ملبہ ملا اور نہ ہی لاشیں۔ سمندر کی سطح پر ایندھن کے نشانات بھی نہیں تھے۔ نیول بورڈ آف انکوائری یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ان طیاروں نے کوئی الارم نہ دیا ہو۔ اور اس کا خیال تھا کہ کوئی تو طیارے سے کودا ہو گا۔ مگر بورڈ کے ماہرین بھی اس پورے معاملے میں کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہے۔

انسانی مقناطیس

جو لوگ اپنی نارمل زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں ان میں لوگ بہت زیادہ دل چسپی لیتے ہیں۔اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ دوسروں کی توجہ پانے کے لئے لوگ اپنی نارمل زندگی کو بڑی آسانی سے خیر باد کہہ ڈالتے ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ دوسروں کی توجہ پانے کے لئے بہت سے لوگ زمین میں کئی دنوں کے لئے دفن بھی ہو جاتے ہیں یا کسی بہت بلند عمارت پر کسی سہارے کے بغیر چڑھتے ہیں۔اور ایسے لوگوں کو لوگ حیران ہو کر دیکھتے ہیں اور اس حیرانی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے وہ کام کیا ہوتا ہے جو کسی نے نہیں کیا ہوتا۔جو کام ہر انسان کے بس کا روگ نہ ہو وہ ظاہر ہے کہ سب کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔

کیا کوئی شخص اپنے اندر برقی قوت پیدا کر سکتا ہے؟ آپ سوچیں گے کہ ایسا ممکن نہیں۔ آپ کی سوچ درست ہے۔کسی بھی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی بھی طرح اپنے جسم کو اس قابل بنائے کہ اس سے بجلی خارج ہو۔مگر قدرت کے لئے ایسا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔وہ جب چاہے اور جسے چاہے، چلتے پھرتے بجلی گھر میں تبدیل کر سکتی ہے۔ایسے لوگ جب کسی سے ملتے ہیں تو انہیں صدمے سے دوچار کرتے ہیں! جو انہیں ہاتھ لگاتا ہے وہ جھٹکا کھاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں سے لوگ دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ایسے میں اس بات کی گنجائش ہی کہاں ہے کہ کسی کے جسم میں برقی قوت ہو اور وہ اس خصوصیت پر فخر کرے؟ آج تک جن لوگوں کے جسم میں قدرتی برقی رو پائی گئی ہے وہ اپنی زندگی سے عاجز ہی دکھائی دیئے ہیں۔اور اس بات کو سمجھنا کچھ بہت زیادہ دشوار نہیں۔رات دن جسم میں برقی رو لئے گھومنا کوئی ایسی بات نہیں جس پر بہت زیادہ خوش ہوا جائے۔

ڈاکٹر ایشکر یفٹ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ کسی انسان کے جسم میں اس قدر بجلی ہو

سکتی ہے کہ جو اسے ہاتھ لگائے، جھٹکا کھائے۔مگر جب وہ جینی مورن سے ملے تو اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

سیڈالیا، مسوری (امریکہ) کی جینی مورن 1895 میں پیدا ہوئی۔جب وہ 14 سال کی ہوئی تب اسے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ اس کے اندر برقی قوت ہے اور یہ کہ جو اسے ہاتھ لگاتا ہے وہ کسی نہ کسی حد تک اس برقی قوت کے اثرات کا سامنا بھی کرتا ہے۔جسم میں برقی قوت کا پیدا ہو جانا جینی کے لئے عذاب کی صورت تھا۔وہ کسی موصل دھات کی بنی ہوئی جس چیز کو ہاتھ لگاتی وہ اس سے چپک کر رہ جاتی۔اگر وہ پانی نکالنے کے لئے سکشن پمپ کے ہینڈل کو ہاتھ لگاتی تو ہینڈل اس کے ہاتھ سے چپک جاتا اور پھر ہاتھ چھڑانا مشکل ہو جاتا۔اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی چیز کو چھونے کی صورت میں اس قدر زوردار اسپارک ہوتا کہ جینی کو بھی شدید تکلیف سے دوچار ہونا پڑتا۔وہ دھاتوں کے برتن میں کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔اس کے لئے خصوصی طور پر ایسے برتن بنائے گئے جو برقی رو کے لئے موصل نہ ہوں۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جینی کے لئے زندگی کیا ہوگئی ہوگی! وہ بے چاری کہیں آنے جانے اور کسی سے ملنے کے قابل نہ رہی۔ماہرین نے اس کا معائنہ کیا مگر وہ اس میں برقی قوت کی موجودگی کا جواز تلاش کرنے میں ناکام رہے۔اس سے ملنے جلنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی۔گھر کی پالتو بلی بھی اس سے دور بھاگتی تھی۔زندگی نے جینی کے لئے ایک عذاب کی صورت اختیار کر لی۔جب جینی 24 سال کی ہوئی تب یہ برقی قوت خود بخود ختم ہوئی اور اس نے سکون کا سانس لیا۔

بونڈن، اونٹاریو کی کیرولین کلیئر کا بھی یہی کیس تھا۔یہ کیس 1877 میں سامنے آیا۔ اس کے خاندان میں موٹاپا چونکہ موروثی وصف تھا اس لئے محض 14 سال کی عمر میں اس کا وزن 130 پاؤنڈز تھا۔وہ اپنے 6 بھائی بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ایک بار وہ بیمار پڑی اور بیمار بھی ایسی کہ جسم گھلنے لگا۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کے وزن میں 40 سے 50 پاؤنڈز کی کمی واقع ہوگئی۔ وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑی۔جاد آنکھوں سے سدا کسی ایک ہی سمت ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی تھی۔جن مقامات پر وہ کبھی نہیں گئی تھی وہاں کی باتیں بھی وہ اس طرح کرتی تھی کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔گھر والوں کا خیال تھا کہ بیماری کی شدت نے اس کے جسم پر ہی نہیں ذہن پر بھی بڑے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔

کیرولین نے اس حالت میں ڈیڑھ سال گزارا۔ وہ صحت یاب تو ہوگئی مگر اب الجھن یہ کھڑی ہوگئی کہ اس کے اندر برقی قوت پیدا ہو چکی تھی اور وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتی اسے شدید جھٹکا لگتا اور یہی نہیں بلکہ وہ مقناطیس کا کام بھی کرتی تھی۔ جس چیز کو وہ چھوتی وہ اس کے ہاتھ سے چپک جاتی۔ کیرولین تو ایک عجیب الجھن میں مبتلا ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس حالت میں کرے تو کیا کرے؟ اونٹاریو میڈیکل ایسوسی ایشن نے اس کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد ایک رپورٹ تیار کی جو 1879 میں ریاست کے سرکار ریکارڈز کا حصہ بنا دی گئی۔ کیرولین بھی خوش قسمت تھی کہ جوان ہونے پر اس میں برقی اور مقناطیسی قوت ختم ہوگئی اور نارمل زندگی گزارنے پر اس نے سکون کا سانس لیا۔

1890 میں 16 سالہ لوئی ہیمبرگر کا کیس سامنے آیا۔ اس میں بھی برقی قوت تھی اور وہ لوہے یا فولاد کی چیزوں کو اپنے ہاتھ سے چپکا لیا کرتا تھا۔ میری لینڈ کالج آف فارمیسی میں اس نے اپنے ان قدرتی اوصاف کا مظاہرہ بھی کیا جس سے طبی اور سائنسی ماہرین بہت متاثر ہوئے۔ مگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

جوپلن، مسوری (امریکہ) کا فرینک میک کنسٹری بھی برقی قوت کا حامل تھا۔ اس کا کیس 1889 میں سامنے آیا۔ وہ اگر رات پرسکون نیند سو کر اٹھتا تھا تو صبح اس کے جسم میں غیر معمولی حد تک برقی قوت ہوا کرتی تھی۔ اور جیسے جیسے دن گزرتا جاتا تھا اس قوت میں کمی واقع ہوتی جاتی تھی۔ سردیوں میں فرینک کے جسم کا چارج بہت بڑھ جاتا تھا۔

چارلس ڈکنس کا جانشین!

چارلس ڈکنس کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ اس کا شمار انگریزی ادب کے عظیم ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کے قارئین کی تعداد بلا مبالغہ کروڑوں میں ہے۔ اس کے مقبول ترین ناولوں میں "Oliver Twist" "Great Expectations" اور "A Tale of Two Cities" سب سے نمایاں ہیں۔ آج بھی ان ناولوں کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ عام طور پر چارلس ڈکنس معاشرتی اور اصلاحی ناول لکھنے میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا اور اس کی شہرت اسی حوالے سے تھی۔ عمر کے آخری حصے میں اس کے ایک دوست نے اسے سسپنس ناول لکھنے کی ترغیب دی۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈکنس کا ٹیلینٹ اس شعبے میں بھی کھل کر سامنے آئے۔ ڈکنس اس معاملے میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس زمانے میں سسپنس یا جاسوسی ناول نگاری نسبتاً نئے فن کا درجہ رکھتی تھی۔ اس طرف بہت کم لوگ آئے تھے۔ ایسے میں ڈکنس کا ذہن چند ایک تحفظات کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ جب دوست نے بہت زور دیا تو وہ ایک سسپنس ناول لکھنے پر راضی ہوا اور یوں اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا۔ ایک میگزین کے لئے اس نے ناول لکھنا شروع کیا۔ طے یہ پایا کہ ناول درجن بھر اقساط میں شائع کیا جائے گا۔ اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس نے اپنی عادت کے خلاف ایک معاہدہ کیا کہ اگر اس ناول کے مکمل ہونے سے پہلے اس کا انتقال ہو جائے تو معاوضے کی رقم اس کے ورثا کو دے دی جائے۔ عام طور پر وہ اپنے ناشرین سے ایسا کوئی معاہدہ کرتا نہیں تھا اس لئے سب کو بہت حیرت ہوئی۔

چارلس ڈکنس نے ناول لکھنا شروع کیا اور اس کی صلاحیتوں نے اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا۔ اس کا پہلا سسپنس ناول لوگوں کو بہت پسند آیا۔ اس نے 1870 میں ناول لکھنا

شروع کیا اور ہر قسط قارئین میں تجسس بڑھاتی چلی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے 6 ماہ بیت گئے۔ بحر اوقیانوس کے دونوں طرف ڈکنس کے لاکھوں پرستار اس ناول کی اگلی قسط پڑھنے کے لئے بے تاب رہا کرتے تھے۔

اور ساتویں قسط لکھنے سے پہلے ڈکنس کا انتقال ہو گیا!

ناشر کے لئے تو الجھن کھڑی ہو گئی۔ اب کیا کیا جائے؟ ناول ادھورا رہ گیا اور قارئین اس ناول کے انجام کے بارے میں سوچتے ہی رہ گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس ناول کو کس طرح اور کس کی مدد سے مکمل کرایا جائے کیونکہ ڈکنس بہت بڑا قلمکار تھا۔ اس کی اپنی ایک حیثیت تھی اور اس کے علمی مرتبے تک پہنچنا اس وقت تو کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور پھر اگر کوئی بڑی ادبی شخصیت اس کام کا بیڑا اٹھا بھی لیتی اور کام درست انداز سے نہ ہو پاتا تو؟ اس صورت میں تو بہت بھد اڑتی! یعنی اس ناول

The Mystery of Edwin Drood

کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھانا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات تھی۔ چارلس ڈکنس کے چاہنے والوں کو محسوس ہونے لگا کہ اب اس کا یہ ادھورا ناول ادھورا ہی رہے گا۔

انہی دنوں بریٹل بورو، ورمونٹ میں ایک شوخ طبیعت کا نوجوان رہنے آیا۔ اس کی چرب زبانی ایسی تھی کہ لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتی تھیں۔ وہ جس محفل میں بھی ہوتا تھا اس کی رونق بن جایا کرتا تھا۔ وہ ہینڈسم تھا۔ خوش لباسی بھی اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ اور بلا کا دل پھینک بھی واقع ہوا تھا۔ ایک بار اس نے ایک خوب صورت لڑکی کا تعاقب کیا اور اس کے گھر تک پہنچ گیا اور پھر اس کے گھر کے سامنے ہی ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ وہ ایک اچھا پرنٹر تھا اور اس میدان میں بھی اس کی صلاحیتوں کا لوہا ماننے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

اس نوجوان پرنٹر کا نام ٹامس پی جیمز تھا۔ اس کی مکان مالکن روحانیت پر غیر معمولی یقین رکھتی تھی اور عملیات کے ذریعے ارواح کو بلانے کا کام بھی کیا کرتی رہتی تھی۔ وہ اس شعبے میں بہت سوں کو مہارت سے ہمکنار کر چکی تھی۔ اس کی گھر بہت سے لوگ روحانیت سیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان میں چند خوب صورت لڑکیاں بھی تھیں۔ ٹامس نے ان پر ڈورے ڈالنے میں سہولت پیدا کرنے کے لئے اپنی مکان مالکن کے ہاں ان مجالس میں جانا شروع کر دیا جو ارواح سے

رابطہ سکھانے کے سلسلے میں ہفتے میں تین دن ہوا کرتی تھیں۔ اور چند ہی دنوں میں کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی ہو گئی۔ ان میں سے ایک لڑکی ویرونیکا سے اس کی دوستی محبت کی حد بڑھ گئی اور دونوں نے ایک دوسرے میں غیر معمولی حد تک دلچسپی لینا شروع کیا۔ کبھی وہ اکٹھے سیر کو چلے جاتے اور کبھی کسی تھیٹر میں کوئی ڈرامہ دیکھنے چلے جاتے۔ اس پر مکان مالکن کو تھوڑا سا اعتراض بھی تھا مگر وہ اس لئے خاموش رہتی تھی کہ ٹامس کی شکل میں اس کے گھر میں ایک مرد رہتا تھا یوں کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کی طرف دیکھ سکے یا اس کے گھر میں نقب لگا سکے۔

روحانیت کی پرسکون مجالس میں شریک ہونا ٹامس کے لئے محض تفریح کی بات تھی مگر یہ تفریح اسے بہت مہنگی پڑی۔ ایک دن وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے سر میں بھاری پن محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سر میں اچانک پیدا ہونے والا بھاری پن کبھی کبھی کسی بہت ہی خطرناک بیماری کی علامت بھی ہوا کرتا ہے۔ اس نے گلا سوکھتا ہوا محسوس کیا اور اٹھ کر ایک گلاس پانی پیا۔ پانی حلق سے اترا تو اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کہیں اس نے کوئی الٹی سیدھی چیز تو نہیں کھالی تھی۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ ہاضمہ بظاہر درست تھا۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت محتاط رہا کرتا تھا۔ یوں بھی اس کی شخصیت میں لڑکیوں کو اس لئے زیادہ کشش محسوس ہوتی تھی کہ وہ بہت ہینڈسم تھا۔ اور وہ اپنی ایسی کسی بھی خصوصیت سے محرومی گوارا نہیں کر سکتا تھا جو لڑکیوں کو اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرتی ہو۔

تھوڑی دیر ٹامس یونہی بیٹھا رہا اور پھر کپڑے بدل کر باہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے ایک بار پھر اپنے سر میں بھاری پن محسوس کیا۔ اس مرتبہ اس کی شدت کم تھی۔ ٹامس گھبرایا تو سہی مگر بہت زیادہ نہیں کیونکہ اس مرتبہ صورت حال اس کے کنٹرول میں تھی۔ وہ آرام کرسی پر دراز ہو کر سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد اسے ایک سرگوشی سنائی دی۔ کوئی اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ ٹامس ایک لمحے کو تو ڈر گیا مگر پھر سنبھلا اور سوچنے لگا کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے وہ اس کے کانوں کا دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے ہی رہا تھا کہ وہی سرگوشی ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ کوئی اس کے بہت قریب تھا۔ ٹامس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس نے پہلے کبھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کیا تھا۔ وہ کسی کو مدد کے لئے پکارنا چاہتا تھا مگر اتنی ہمت اس کے اندر

نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اس پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اب تو واقعی اس کی گھبراہٹ شدید خوف میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے اپنی قوت جمع کی اور پوچھا تم کون ہو۔ جو بھی چیز اس پر حاوی ہو رہی تھی وہ الگ ہو گئی اور کمرے کے دوسرے کونے سے ٹامس کو وہی سرگوشی سنائی دی۔ اس مرتبہ کوئی کہہ رہا تھا کہ ڈرو مت، میں تمہارا دوست ہوں۔ یہ سن کر ٹامس کی جان میں جان آئی۔ اب وہ خاصا پرسکون ہو کر سانس لینے لگا۔ جو غیر انسانی وجود اس پر حاوی ہونا چاہتا تھا وہ اس کا دوست تھا، یہ جان کر اس کے لئے اب پریشان ہونے کی بظاہر کوئی وجہ باقی نہیں بچی تھی۔ مگر اب بھی ذہن میں ایک الجھن تو ضرور باقی تھی۔ فطری سی بات ہے کہ ٹامس جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ ہے کون اور اس سے کیا چاہتا ہے؟ اس نے پوچھ ہی لیا۔

اور جو جواب ملا اس نے اسے شدید حیرت سے دوچار کر دیا۔

کمرے میں موجود غیر مادی یا روحانی وجود نے بتایا کہ وہ چارلس ڈکنس ہے۔ اس انکشاف نے ٹامس کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس سے رابطہ کرنے والی روح اس قدر عظیم ادیب کی ہو گی! اس دور میں چارلس ڈکنس ہر اس شخص کے لئے ایک بہت بڑا نام تھا جو اعلیٰ ادبی فن پاروں سے مستفید ہونے کی اہلیت اور شوق رکھتا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر چارلس ڈکنس جیسے عظیم ناول نگار کی روح کو ٹامس سے رابطہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بات یہ تھی کہ چارلس ڈکنس اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوا تھا کہ اس کا آخری اور واحد سسپنس ناول ادھورا رہ گیا تھا اور وہ اس ناول کو ہر حال میں مکمل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے لئے اس دنیا میں دوبارہ آنا ممکن نہیں تھا۔ یہ کوئی بہت بڑی مشکل نہیں تھی۔ اس مشکل سے تدارک کی ایک مؤثر صورت یہ تھی کہ کسی بھی انسان کو اپنے ذریعے (medium) میں تبدیل کر کے اس تک اپنی بات پہنچا دی جائے۔ اور چارلس ڈکنس نے ٹامس کو اپنے ذریعے کے حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ جسے پہلے کبھی ذریعہ بننے کا ''موقع'' نہ ملا ہو اس کے لئے یہ تجربہ واقعی بہت پریشان کن ہوا کرتا ہے اور ٹامس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب اس نے یہ سنا کہ چارلس ڈکنس اسے اپنا ذریعہ بنانا چاہتا ہے تو وہ سہم گیا اور اس کی بھی بڑی معقول وجہ تھی۔ اس نے اپنی مکان مالکن سے سن رکھا تھا کہ جسے ذریعہ بنا لیا گیا ہو

اس کی زندگی پر خود اس کا اختیار برائے نام رہ جاتا ہے۔ اور پھر اس سے بھی بڑی قباحت یہ ہے کہ جس کے بارے میں یہ مشہور ہو جائے کہ اس پر کسی کا سایا ہے اس کے بارے میں لوگوں کی رائے بدل جاتی ہے۔ سبھی اس سے کتراتے ہیں اور یوں اس کی شخصیت غیر محسوس طور پر نہایت پراسرار اور غیر دنیوی سی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ٹامس اس بات سے بہت ڈرتا تھا۔ اس کی تو بہت رنگین زندگی تھی۔ اس سے بھلا یہ بات کس طرح گوارا ہو سکتی تھی کہ کوئی اس پر یوں حاوی ہو کہ اس کی شخصیت ہی اس کے کنٹرول میں نہ رہے؟

چارلس ڈکنس کی روح سے ٹامس کا اگلا رابطہ دو دن کے وقفے سے اس وقت ہوا جب وہ ایک پارک میں شام کے حسین لمحات گزار کر واپس آیا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ وہاں کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔ اور پھر خیال آیا کہ چارلس ڈکنس کی روح کے سوا بھلا کون ہو سکتا ہے؟ اب کے ٹامس ذرا سا بھی خوفزدہ نہیں تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ چارلس ڈکنس کی روح اسے کم از کم نقصان تو نہیں پہنچانا چاہتی۔ اور جب نقصان کا کوئی احتمال نہیں تھا تو پھر ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

مگر اگلے ہی لمحے وہ شدید بدحواسی میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اپنی مکان مالکن سے یہ سن رکھا تھا کہ جب کسی پر کوئی ''سایا'' ہو جاتا ہے تو وہ شخص اس غیر دنیوی وجود کی موجودگی کو فوراً محسوس کر لیتا ہے! ٹامس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کسی نادیدہ ہستی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اس پر اب وہ ہستی سوار ہوتی جا رہی تھی۔ یہ احساس ٹامس کے لئے اس قدر پریشان کن تھا کہ چند لمحوں تک تو وہ سوچنے اور سمجھنے صلاحیت سے محروم رہا۔ پھر اس نے حواس بحال ہونے پر پوری توجہ کے ساتھ صورت حال پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے پہلے کہ معاملہ بہت بگڑ جائے، اسے اپنی مکان مالکن کو کہانی الف سے ی تک سنا دینی چاہئے تاکہ وہ اس صورت حال کے تدارک کے حوالے کچھ کر سکیں۔

ٹامس بھاگم بھاگ مسز اینڈریو کے پاس پہنچا اور انہیں اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کی باتیں سنتی رہیں اور پھر اس احساس سے ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا کہ ان سے ''رابطہ'' کرنے کا ہنر سیکھنے والے ایک نوجوان کو چارلس ڈکنس کی روح نے ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے! انہوں نے ٹامس کو چند کام کی باتیں بتائیں تاکید کی کہ روح کو ناراض کرنے سے گریز کرے۔ وہ خود بھی چارلس ڈکنس کی روح سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔

چار دنوں کے وقفے سے چارلس ڈکنس (کی روح) نے پھر ٹامس سے رابطہ کیا اور اس مرتبہ اسے بتادیا کہ وہ اپنا ''دی مسٹری آف ایڈون ڈروڈ'' نامی ناول مکمل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی مکان مالکن کے مشورے سے ٹامس نے اس کام میں ذریعہ بننے کے لئے تیار تھا۔ مسز اینڈریو اس قدر خوش تھیں کہ انہوں نے ٹامس سے کہہ دیا کہ وہ جب تک چاہے ان کے ہاں مفت رہ سکتا ہے۔ ان کے لئے یہ اعزاز کیا کم تھا کہ چارلس ڈکنس کی روح ان کے گھر میں آیا کرے گی!

ٹامس نے چارلس ڈکنس کی روح کی طرف سے املا لکھنا شروع کیا۔ ان دونوں کے سیشن مختلف دورانیوں کے ہوا کرتے۔ کبھی ٹامس تین تین چار چار گھنٹے بیٹھا لکھا کرتا اور کبھی بمشکل چند ہی سطریں لکھ پاتا تھا۔ بات یہ تھی کہ خراب موسم میں دونوں کے مابین رابطہ بہت دشوار ہوتا تھا اور اگر ٹامس کسی لڑکی سے مل کر آتا اور اس کے خیالوں میں وہی لڑکی ہوتی تو روح کو رابطہ کرنے میں غیر معمولی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا!

اس معاملے کو خفیہ رکھنے کی بہت کوشش کی گئی مگر کسی نہ کسی طرح اس کی بھنک اخبارات کو پڑ ہی گئی۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اندازوں اور توقع کے مطابق تھا۔ ناول کی تکمیل اور تکمیل کے پراسرار طریقے کو ایک بڑے ادبی فراڈ کا نام دیا گیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ٹامس چارلس ڈکنس کے نام پر دنیا کو بے وقوف بنا کر مال اور نام بٹورنا چاہتا ہے اور یہ کہ چارلس ڈکنس کی روح کا قصہ محض ایک افسانہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

ان باتوں سے ٹامس کو دکھ تو بہت ہوا مگر وہ حوصلہ ہارے بغیر دل جمعی سے اپنے کام میں جتا رہا اور اس کی کوشش یہی رہی کہ ناول جلد از جلد مکمل ہو جائے۔ اور پھر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔ ناول مکمل ہوا اور اس کا معیار دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔ تنقید کرنے والوں کی زبانوں پر تالے پڑ گئے۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ مسز اینڈریو کے گھر میں واقعی ایک داستان معرض وجود میں آنے کی تیاری کر رہی تھی۔ ٹامس نے چارلس ڈکنس کے ناول کو اس طرح مکمل کیا تھا کہ ادب کی دنیا پر گہری نظر رکھنے والے بھی داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے لئے یہ سب خواب کی مانند تھا۔ روشن خیال افراد کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی روح کے ہاتھوں ناول کی تکمیل کی کہانی کو تسلیم کر کے غیر معمولی نکتہ چینی کا راستہ کھولیں اور جو کچھ دکھائی دے رہا تھا اسے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ ان کے لئے یہ صورت حال ایک بہت بڑے مخمصے سے کم نہیں تھی۔ اس دور کے تمام بڑے ناقدین نے ٹامس جیمز کے

ہاتھوں تکمیل سے ہمکنار ہونے والا ناول بڑی باریکی سے پڑھا اور تصدیق کی کہ یہ اسٹائل واقعی چارلس ڈکنس کا ہے۔ مگر وہ یہ کیسے مان لیتے کہ ڈکنس کی روح املا کرانے آیا کرتی تھی؟ اس صورت میں تو ان کی روشن خیالی کی عمارت ہی زمیں بوس ہو جاتی!

اس معاملے میں حتمی رائے کے لئے شرلاک ہومز جیسے عظیم کردار کے خالق سر آرتھر کونن ڈائل سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے پورا ناول پڑھنے اور اس کے تمام جزئیات کا جائزہ لینے کے بعد لکھا، ''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ ناول بڑی محنت اور غیر معمولی صلاحیت کی مدد سے مکمل کیا گیا ہے اور اگر ہم ناول کے اس حصے کا بغور جائزہ لیں جو ٹامس جیمز نے لکھا ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس نے پیروڈی میں بھی اصل کی روح کو کہیں پیچھے نہیں رہنے دیا۔ ایسی عمدگی کی مثال کم کم ہی ملے گی۔''

ٹامس جیمز اپنے دعوے میں سچا تھا۔ اگر چارلس ڈکنس کی روح اس کے پاس نہ آیا کرتی تو وہ ناول مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ راتوں رات وہ شہرت سے ہمکنار ہوا تھا اسی طرح گمنام بھی ہو گیا۔ وہ کسی بھی اعتبار سے کوئی ادبی انسان نہیں تھا۔ اس نے اس ناول سے قبل کوئی معیاری ادبی چیز لکھی، اس کے بعد۔ کبھی کسی کو اس کی گفتگو سے بھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کوئی ادبی شخصیت ہے۔ اور گمنامی کی حالت میں ہی وہ اس دنیا سے رخصت بھی ہوا۔ آج بھی

The Mystery of Edwin Drood

کا وہ نسخہ کہیں کہیں مل جاتا ہے جو ٹامس پی جیمز نے مکمل کیا تھا۔ اس نسخے کو باریکی سے پڑھنے والوں کا سر اب بھی چکرائے بغیر نہیں رہتا۔ وہ طرح طرح کے تصورات میں کھو جاتے ہیں۔

وہ آگ جو سمجھ میں نہ آ سکی!

سینٹ پیٹرز برگ ،فلوریڈا (امریکہ) میں یہ 2 جولائی، 1951 کی بات ہے۔اس دن کا آغاز بھی ایک عام دن کی مانند ہوا۔صبح کے آٹھ بج چکے تھے اور مسز ریزر ابھی تک بیدار نہیں ہوئی تھیں۔عام طور پر مسز کارپینٹر اپنی کرائے دار مسز ریزر کے ساتھ ہی صبح کی کافی لیتی تھیں۔ اس بڑھاپے میں ان کے لئے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں تھی کہ اپنی ہم عمر خاتون کے ساتھ وہ جی بھر کے باتیں کر سکتی تھیں اور انہیں اپنی پسند و ناپسند سے آگاہ کر سکتی تھیں۔

صبح سات بجے مسز ریزر کے لئے ایک ٹیلی گرام آیا تھا مگر چونکہ کئی مرتبہ دستک دینے پر بھی انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا اس لئے پوسٹ مین وہ ٹیلی گرام مسز کارپینٹر کو دے گیا تھا۔ مکان مالکن وہ ٹیلی گرام بھی مسز ریزر کو دینا چاہتی تھیں۔انہوں نے اوپری منزل میں واقع ان کے کمرے کی کنڈی کھڑکا کر دستک دی۔مگر یہ کیا؟ کنڈی تو ایسی گرم تھی جیسے کسی نے اسے چولہے پر رکھا ہو۔وہ گھبرا گئیں اور فوراً نیچے جا کر انہوں نے پڑوس میں کام کرنے والے مزدوروں کو مدد کے لئے پکارا۔مزدوروں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور جب وہ نہ کھلا تو اسے توڑ دیا۔اندر ایک ایزی چیئر (آرام کرسی) پر مسز ریزر موجود تھیں مگر اس طرح کہ ان کی اب راکھ ہی باقی بچی تھی! اور ان کی آرام کرسی کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔یہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھ کر مسز کارپینٹر بے ہوش ہو گئیں۔

مسز ریزر کے جسم میں صرف بائیں ٹانگ اور کھوپڑی بچی تھی۔اور کرسی میں صرف کوائل سلامت رہی تھی۔تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں مگر اس کے باوجود وہاں بلا کی گرمی تھی۔فوری طور پر پولیس کو طلب کیا گیا۔پولیس نے فائر بریگیڈ کی خدمات حاصل کیں تا کہ جو کچھ بھی ہوا اس کے بارے میں کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے مگر بہت سوچ بچار اور موقع کا جائزہ لینے کے بعد

بھی کوئی کام کی بات معلوم نہ کی جا سکی۔

پر اسرار آگ نے کرسی اور مسز ریزر کو نشانہ بنانے کے علاوہ کرسی کے نیچے موجود غالیچے کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا تھا اور اسی ساتھ رکھی ہوئی الیکٹرانک گھڑی کا کنکشن جس میں لگا ہوا تھا اس ساکٹ کو بھی بھسم کر دیا تھا جس کے باعث فیوز اڑ گیا تھا اور الیکٹرانک گھڑی چار بج کر بیس منٹ پر بند ہو گئی تھی۔کمرے میں اور کسی چیز کو کچھ خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔دیوار میں نصب ایک شیشہ چٹخ گیا تھا۔

نیشنل بورڈ آف انڈر رائٹرز کے ایک ماہر نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ مسز ریزر اور ان کی کرسی کا جو حشر ہوا وہ آگ سے ہوا مگر ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ آگ کیسے لگی۔

مختلف امکانات پر غور کیا گیا۔اس بات کا امکان بہت معدوم تھا کہ بجلی گری ہو اور مسز ریزر اس کی زد میں آئیں ہوں! ساکٹ تو پہلی ہی جل چکا تھا اس لئے شارٹ سرکٹ بھی نہیں ہوا تھا۔موقع سے کوئی مائع چیز، کوئی کیمیکل یا گیزولین بھی نہیں ملی جس سے آگ لگنے کا امکان ہو۔مسز ریزر سگریٹ بھی نہیں پیتی تھیں۔

ماہرین نے بتایا کہ مسز ریزر اور ان کی کرسی کا جو حشر ہوا اس کے لئے کم از کم ڈھائی ہزار ڈگری کی آگ درکار ہوا کرتی ہے۔اور اتنی شدید حدت کی وہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

ماہرین نے بہت سوچا مگر اس عقدے کے وا ہونے کی راہ ہموار نہ ہوئی۔اور جب ماہرین کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھے تو پھر پولیس اور اس سے متعلق اداروں کی کیا حیثیت تھی کہ کوئی ماہرانہ رائے دیتے! پولیس چیف اور ڈیٹیکٹو چیف نے اپنی سی پوری کوشش کرنے کے بعد اس کیس کی فائل پر لکھا کہ مسز سگریٹ پی رہی تیں کہ آگ لگ گئی۔فائل کو بند کرنے اس سے اچھا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔عام طور پر سرکاری فائلیں اسی طرح بند کی جاتی ہیں۔

کبھی دیکھی ہے ایسی کار؟

جن لوگوں میں اعتقاد کی کمزوری ہوتی ہے وہ ہر معاملے کے پس منظر میں کسی نہ کسی اچھے یا برے شگون کو تلاش کرتے ہیں۔ اسی سوچ کی بنیاد پر بہت سے لوگوں کو منحوس قرار دیا جاتا ہے اور بہت سوں کو ''لکی''۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی منحوس ہوتا ہے اور نہ کوئی خوش قسمت بلکہ یہ محض سوچنے کا فرق ہے۔

جس کا یہاں ہم ذکر کر رہے ہیں وہ بہت ''منحوس'' کار تھی۔ بہت سے لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اس کا وجود نہ ہوتا تو براہ راست 16 افراد کی موت واقع نہ ہوتی اور شاید پہلی جنگ عظیم بھی نہ ہوتی!

اس کار میں اس قدر نحوست تھی کہ جس نے بھی اسے ہاتھ لگایا وہ برباد ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ لوگ خود ہی اسے جان بوجھ کر گلے لگاتے رہے اور موت سے دوچار ہوتے رہے۔ اور آخر کار اس کار کی تباہی بھی بہت انوکھے انداز سے ہوئی۔

جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ ایک لگژری کار تھی جس میں 6 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور اسے یوگوسلاویہ کے شاہی جوڑے کے لئے ایک بار پھر تزئین و آرائش کے مرحلے سے گزارا گیا تھا۔ اس کار میں بیٹھ کر آرک ڈیوک فرانز فرڈینینڈ اور ڈچز آف ہوہنبرگ موجودہ بوسنیا ہرزیگوینا کے دارالحکومت سراجیوو کی سیر کرنا چاہتے تھے اور یہ سیر انہیں بہت مہنگی پڑی کیونکہ اس کے بعد وہ کسی بھی مقام کی سیر کے قابل نہ رہے!

یہ 18 جون، 1914 کی بات ہے۔ اس دن سراجیوو کا موسم بہت اچھا تھا اور شاہی جوڑا اس سہانے موسم کا لطف لینا چاہتا تھا۔ مگر ایک قباحت تھی۔ موسم میں کوئی خرابی نہیں تھی مگر سیاسی کشیدگی ان دنوں غیر معمولی شدت اختیار کر چکی تھی اور اسی لئے مشیروں نے مشورہ دیا تھا کہ

اس طرح ایک ایسے شہر میں سیر سپاٹا خطرے سے خالی نہ ہوگا جہاں یوگوسلاویہ کی حکومت اور شاہی خاندان سے بغض رکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ مگر شہزادہ فرڈینینڈ اپنے موڈ اور مزاج کا انسان تھا۔ اس کا جی سیر کرنے کو چاہ رہا تھا اس لئے وہ کسی بھی بات کی پرواہ کئے بغیر نکل پڑا۔ اس نے اپنے محافظوں سے کہہ دیا کہ اگر وہ جان کا خطرہ محسوس کرتے ہیں تو کوئی بات نہیں، سرکاری قیام گاہ میں رہیں۔ وہ تنہا بھی سیر کو جانے کے لئے تیار تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سیر کو جائے اور چاروں طرف خطرات کے بادل منڈلاتے دیکھ کر بھی محافظ اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہ ہوں؟

دونوں نے کار میں اس پیارے سے شہر کا سفر شروع کیا۔ ان دنوں، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، یورپ میں سیاسی کشیدگی اپنی تمام منطقی حدود کو چھو چکی تھی اور اب کئی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لینے والی جنگ کو شروع ہونے کے لئے محض ایک بہانہ درکار تھا۔ اور یہ بہانہ اس دن معرض وجود میں آ گیا۔ چند باغی نوجوانوں نے آرک ڈیوک کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی اور اس منصوبے کے بارے میں شاہی جاسوسوں نے آرک ڈیوک کو پہلے سے آگاہ بھی کر دیا تھا مگر وہ اس معاملے کو دل پر لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی آئی ہوئی تھی اس لئے ٹالے نہ ٹلی اور ٹلی تو جان لے کر ٹلی! ہونی کو ٹال بھی کون سکتا ہے؟

شاہی جوڑا کار میں سیر کو نکلا۔ کار بڑے مزے سے چل رہی تھی۔ پیچھے گھوڑوں پر محافظ بھی تھے۔ یہ شہر سبزے کی آماجگاہ تھا۔ اس کی ہریالی پورے خطے میں مشہور تھی۔ اور شہزادے کو اس کی یہ قدرتی خوبصورتی ہی کھینچ کر یہاں تک لائی تھی۔ اتنے خوبصورت شہر میں کوئی باغی بھی رہتا ہوگا اس کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ شاہی جوڑا جہاں سے گزرتا لوگوں کی دل آویز مسکراہٹ ان کا استقبال کرتی اور وہ بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے اور یوں تھوڑی سی سیاسی محرومی کے اسیروں کو یہ پیغام ملتا کہ اس ملک کا اگلا فرماں روا ان سے پیار کرتا ہے!

ایک سڑک پر کسی نے کار کو نشانہ بنا کر ایک بم اچھال دیا اور، تھوڑی دیر کے لئے، دونوں کی خوش قسمتی کہ کار کے بونٹ سے ٹکرا کر بم سڑک پر پھٹ گیا اور چار محافظ صرف زخمی ہوئے۔ شاہی کار رک گئی۔ شہزادے نے اتر کر محافظوں کے زخموں کا جائزہ لیا اور انہیں اسپتال روانہ کرنے کے بعد اپنا سفر از سر نو شروع کیا۔ سب کے لے یہ بہت حیرت کی بات تھی۔ فرانز

فرڈینینڈ اپنی زندگی سے کھیل رہا تھا اور اس پر سب کے چہروں سے خوف صاف جھلک رہا تھا۔ مگر کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس کے سامنے زبان کھول سکتا۔

ڈرائیور شہر کے چپے چپے سے واقف تھا مگر نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ کار کو شہر کے ایک حصے میں لے گیا جو آگے جا کر بند ہو جاتا تھا۔ اس علاقے میں سکیورٹی کا معقول انتظام نہیں تھا اور اسی ایک فیکٹر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں باغی پہلے ہی گھات لگا کر بیٹھے تھے۔

ان باغیوں میں آرتھوڈوکس اور پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کے علاوہ ایک مسلم نوجوان بھی شامل تھا۔ یہ سب وطن پرست تھے اور اپنے وطن کی آزادی کے لئے کوئی بھی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ ان میں ہر ایک کی ذمہ داری کا تعین بہت پہلے کر دیا گیا تھا تاکہ عین وقت پر کوئی گڑبڑ نہ ہو اور شاہی جوڑے کو اس دنیا سے رخصت کرنا آسان ہو جائے! ایسا نہیں تھا کہ شاہی جوڑے کو قتل کرنے کا پروگرام راتوں رات طے پایا تھا۔ یہ گروپ دو سال سے اس منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ حکومتی حلقوں کو ان کی بہت سی سرگرمیوں کا علم تھا اور چند ارکان کو گرفتار بھی کیا جا چکا تھا مگر اس کے باوجود پورے گروپ کا سراغ لگانے میں حکومت ناکام رہی تھی۔ یہ لوگ زیر زمین سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ انہیں بہت تیزی سے ٹھکانے بدلنے پڑتے تھے۔

اس دن ایسا لگتا تھا جیسے مقدر ان کے ساتھ ہے اور ہر کام بڑی آسانی سے بنتا جا رہا تھا۔ ایک طرف قسمت ان پر مہربان تھی اور دوسری طرف شہزادہ بھی بڑی خوشی سے اپنی موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ہر مشورے کو مسترد کر رہا تھا اور اس پر اس کے محافظ اور عملے کے دیگر افراد سخت پریشان تھے۔ انہیں یقین تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔

ڈرائیور کی مہربانی سے جب کار ایک بڑی مگر بند گلی میں پھنس گئی تو وہاں چھپے ہوئے باغیوں نے حالات کا جائزہ لیا۔ محافظ پیچھے رہ گئے تھے۔ انہیں شہزادے کی کار تک آنے میں کم از کم چار پانچ منٹ تو لگنے ہی تھے۔ اس سے اچھا موقع بھلا کب مل سکتا تھا؟ ایک نوجوان نے جب دیکھا کہ وہ کار سے بہت قریب ہے اور کود کر اس میں داخل بھی ہو سکتا ہے تو اس نے بڑی پھرتی سے کار کے بونٹ پر چڑھ کر انتہائی قریب سے آرک ڈیوک کو کئی گولیاں سینے میں داغ دیں اور دوسرے ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول سے اس نے ڈچز آف ہوہنبرگ کو بھی نشانہ بنایا۔ شہزادے اور شہزادی کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی کیونکہ گولیاں بہت قریب سے داغی گئی

تھیں۔ اس قدر قریب سے گولیاں کھا کر کون زندہ رہتا ہے؟ جب تک محافظوں نے اس نوجوان کو قابو میں کیا تب تک شاہی جوڑا دم توڑ چکا تھا۔

فرانز فرڈینینڈ اور ڈچز آف ہوہنبرگ کی ہلاکت نے یورپ بھر میں کھلبلی مچا دی۔ حالات نے اچانک بھرپور پلٹا کھایا اور یوں پہلی جنگ عظیم نے شروع ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس وقت تک کی تاریخ کی سب سے بڑی اس جنگ نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ جرمنی کی انتہائی نسل پرستی نے یورپ میں نظریات کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا اور دنیا عملاً دو گروپوں میں بٹ گئی۔ اتحادی ممالک نے مل کر جرمنی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ اس دور میں جرمنی کو قابو میں کرنا کسی ایک ملک کے بس کی بات نہیں تھی۔ جنگی جنون نے پورے جرمنی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور ہر جرمن دنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اسے غیر معمولی پروپیگنڈے کے ذریعے اس بات کا یقین دلا دیا گیا تھا کہ وہ سب سے اعلیٰ نسل کا انسان ہے اور دنیا پر راج کرنے کا حق صرف اسے ہے! جرمنی کے اس بدلے ہوئے نظریاتی ڈھانچے نے پہلی جنگ عظیم کو راہ دی جس میں دو کروڑ سے زائد افراد مارے گئے۔ اور مادی نقصان اس قدر ہوا کہ شہر کے شہر تباہ ہو گئے اور متاثرہ ممالک کی معیشتی بحالی میں کئی عشرے لگ گئے۔

کار کی نحوست کا سفر شروع ہو چکا تھا!

جنگ چھڑنے کے ایک ہفتے بعد پانچویں آسٹرین کور کے کمانڈر جنرل پیٹیوریک نے سراجیوو میں گورنر ہاؤس کا چارج لیا۔ گورنر ہاؤس میں کھڑی ہوئی وہ کار بھی ان کے حصے میں آئی۔ یہ کار پہلی ہی نظر میں ان کی نظر میں بس گئی۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ اسی کار میں شاہی جوڑا ہلاک ہوا تھا۔ کئی ہفتوں سے یہ کار خبروں میں تھی اس لئے وہ اسے پا کر بہت خوش تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جب وہ کار میں سوار ہو کر نکلیں تو لوگ کہیں کہ یہ وہی کار ہے جس میں شاہی جوڑے کو ہلاک کیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ بات بہت اہم تھی کہ انہیں کسی ایسی چیز کے حوالے سے بھی لوگ یاد رکھیں جو عوامی سطح پر معروف ہو۔ اور اس زمانے میں اس کار سے زیادہ معروف چیز بھلا کیا ہو سکتی تھی؟ کئی دن تک جنرل پیٹیوریک اس میں سوار ہو کر خوشی خوشی شہر بھر میں گھومتے پھرے۔ مشیروں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس طرح بغیر کسی سکیورٹی کی اس کار میں گھومتے نہ پھرا کریں مگر وہ کسی کا مشورہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ شہر بنیادی طور پر باغیوں کا تھا اور ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنی حکومت کے باغی رہے ہوں انہیں بھلا اس ماحول میں

کسی غیر پر حملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

مگر یہ خوشی صرف تین ہفتوں میں کافور ہوگئی!

کار نے ایک بار پھر نحوست کا سفر شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسے واقعات نے درشن کرائے کہ خود جنرل پیٹیوریک کو بھی یقین نہیں آیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

ویلیٹیو میں جنرل پیٹیوریک کو ایک معرکے میں گھمسان کی لڑائی کے بعد شکست ہوئی۔ اس شکست کے آثار نہیں تھے اور یہی سبب ہے کہ جب شکست ہوئی تو کئی دنوں تک انہیں یقین ہی نہیں آیا۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جن کے وجود پر آسٹریائی فوج کو فخر تھا۔ ان سے کمانڈ چھین لی گئی اور انہیں ویانا واپس بھیج دیا گیا۔

یہ تو بڑی ذلت کی بات تھی۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ انہیں تنزلی کی ذلت سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ تنزلی نے انہیں چڑچڑا کر دیا اور وہ نفسیاتی مریض ہوگئے۔ بات بات پر پھٹ پڑنا ان کے معمول کا حصہ ہوگیا اور اس سے ان کی تمام قائدانہ صلاحیتیں دب کر رہ گئیں۔ اور پھر اسی چڑچڑے پن اور نفسیاتی پیچیدگی کی حالت میں ان کا انتقال ہوا!

جنرل پیٹیوریک کے اسٹاف میں شامل کیپٹن آرمیٹس کو اس منحوس کار کا چارج ملا۔ وہ اس کار کو پا کر بہت خوش تھا۔ کئی لوگوں نے اس کی توجہ کار کی نحوست کی طرف دلائی مگر وہ ایک پڑھا لکھا، روشن خیال شخص تھا۔ اسے توہمات سے کوئی کام نہیں تھا۔ تمام باتوں کو سر سے جھٹک کر وہ کار میں گھومنے پھرنے لگا۔ ایک مشہور کار کو پا کر وہ بھی جنرل پیٹیوریک کی مانند بہت خوش تھا مگر صرف ایک ہفتے بعد اس کی خوشی بھی مٹی میں مل گئی۔

ایک دن وہ کار میں ہائی وے پر جا رہا تھا کہ رفتار بہت زیادہ ہوجانے کے باعث کار اس کے قابو میں نہ رہی اور دو کروشیائی کسان اس سے کچل کر ہلاک ہوگئے۔ اور معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ تیز رفتاری کے باعث کار ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ اس حادثے میں کیپٹن آرمیٹس کی موت واقع ہوگئی! مجموعی طور پر وہ کار آرمیٹس کے استعمال میں صرف نو دن رہی۔

اب یہ کار یوگوسلاویہ کے نئے گورنر کے استعمال میں آئی۔ تب تک اس کار کی نحوست کی باتیں بچے بچے کی زبان پر آچکی تھیں مگر گورنر بھی روشن خیال انسان تھے اور نحوست وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے کار کی نئے سرے سے آرائش کرائی۔ یہ کار چار ماہ تک ان

کے استعمال میں رہی۔ اس دوران چار مرتبہ یہ حادثات کا شکار ہوئی اور چوتھے حادثے میں گورنر کو دائیں ہاتھ سے محروم ہونا پڑا!

اب کار کی نحوست تسلیم شدہ امر تھی۔ سرکاری طور پر حکم دیا گیا کہ اس کار کو تلف کردیا جائے۔ ابھی کار کو تلف کرنے کے بارے میں سوچا ہی جارہا تھا کہ اس کا ایک خریدار سامنے آگیا۔ یہ ایک ڈاکٹر تھا۔ اور نحوست یا سعادت کے عقیدے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے کار خریدی۔ کوئی بھی شخص اس کار کو چلانے پر راضی نہ ہوا۔ تنگ آکر ڈاکٹر نے خود ہی ڈرائیونگ بھی شروع کردی۔ 6 ماہ خیریت سے گزر گئے اور سب کو یقین ہوگیا کہ کار کی نحوست کی بات غلط تھی۔ مگر پھر ایک دن لوگوں نے عجیب تماشا دیکھا۔ ایک سڑک کے کنارے کار الٹی پڑی تھی۔ اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ مگر ڈاکٹر؟ وہ کار کے نیچے دب کر ہلاک ہوگیا تھا!

ڈاکٹر کی بیوی نے کار ایک متمول جوہری کے ہاتھ فروخت کردی۔ اور ایک سال بعد اس جوہری نے خودکشی کرلی!

جوہری کی بیوہ نے کار ایک اور ڈاکٹر کو فروخت کی۔ یہ ڈاکٹر بھی بہت روشن خیال تھا اور اس بات پر یقین نہیں رکھتا تھا کہ کوئی چیز منحوس بھی ہوسکتی تھی۔ اس نے کار اپنے پاس رکھی مگر ڈر کے مارے مریضوں نے اس کے پاس آنا چھوڑ دیا۔ تنگ آکر ڈاکٹر نے وہ کار ایک کار ریس ڈرائیور کو دے دی۔ ایک دن اس ریسر نے تیز رفتاری کے باعث ایک قلعہ نما مکان کے دیوار میں کار دے ماری اور اس کی لاش اس قدر مسخ ہوگئی کہ اسے پہچاننا بھی دشوار ہوگیا!

اب اس کار کو سراجیوو کے ایک کسان نے خریدا۔ اس نے کار کی مرمت بھی کروائی اور اسے چلانے لگا۔ کئی ماہ گزر گئے اور کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ ایک دن سڑک پر کار بند ہوگئی اور لاکھ کوشش کرنے پر بھی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ کسان نے ایک بیل گاڑی والے سے بات کی اور اس کے پیچھے کار کو باندھ کر شہر کی طرف چلا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ کار اسٹارٹ ہوگئی اور بیل گاڑی پر چڑھ گئی اور اپنے مالک کو کچل کر ہلاک کردیا۔

کسان کی بیوہ سے اس کار کو کوڑیوں کے مول ایک میکینک نے خریدا۔ وہ مرمت کے بعد اس کار کو فروخت کرنا چاہتا تھا مگر کوئی اسے لینے کو تیار نہ ہوا۔ اس نے کار کا رنگ تبدیل کیا۔ اب یہ نیوی بلیو رنگ کی تھی مگر اب بھی کوئی اسے ہاتھ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوا اور تنگ آکر میکینک نے اسے اپنے استعمال میں رکھ لیا۔ اب اس کار کی ''شہرت'' دور دور تک پھیل چکی

تھی۔ ایک وہ میکینک، ٹائبر ہرش فیلڈ، اپنے دوستوں کے ساتھ شادی کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ راستے میں انہوں نے ایک گاڑی کو اوورٹیک کرنا چاہا مگر اس کوشش میں گاڑی ڈرائیور کے کنٹرول میں نہ رہی اور ایک دوسری گاڑی ٹکراتی ہوئی ایک بڑے درخت میں گھس گئی۔ اس حادثے میں ہرش فیلڈ سمیت پانچ افراد ہلاک ہوئے!

حکومت نے کار کو اپنے خرچ پر ویانا کے میوزیم میں رکھوا دیا۔ کم از کم 16 افراد کو ہڑپ کر جانے والی اس کار کو ہزاروں لوگوں نے دیکھا۔ آپ کے ذہن میں شاید یہ سوال ابھرے کہ اتنے لوگوں کی موت کا سبب بننے والی اس منحوس کار کی موت کس طرح واقع ہوئی؟ اس معاملے میں یہ بھی کار غیر معمولی ثابت ہوئی۔ اس نے اپنی موت کے لئے ایک اور عالمی جنگ کا انتظار کیا اور دوسری جنگ عظیم میں ویانا پر اتحادی افواج کی بمباری کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوئی!

خوابوں کی دنیا

مکمل طور پر کوئی آج تک نہیں سمجھ پایا کہ خوابوں کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ ہماری بہت سی ناآسودہ خواہشات خواب میں کیونکر پوری ہوتی ہیں۔ خوابوں کا بنیادی فعل، ماہرین نفسیات کے مطابق، یہ ہے کہ دن بھر ذہن میں جمع ہونے والی معلومات کی چھانٹی ہو اور کام کی باتوں کے سوا سبھی کچھ کچرا کنڈی میں چلا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو خواب ہمارے لئے ایک بہت بڑی نعمت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر عام طور پر اچھا خواب اسی وقت دکھائی دے سکتا ہے جب ہم پرسکون کے مزے لیں۔

آیئے، چند عجیب و غریب واقعات کے حوالے سے خوابوں کی حیرت انگیز دنیا اور اس کی کرشمہ سازیوں کا جائزہ لیں۔ اگر ان قصوں کو پڑھ کر آپ کی عقل دنگ رہ جائے تو اس میں آپ کی عقل کی کوئی خامی نہیں۔

جب روح نے ایک لفظ کا ترجمہ سجھایا

آشوری تہذیب کے بارے میں ڈاکٹر ہرمن ہلپریٹ کو لوگ حرف آخر کا درجہ دیتے ہیں۔ انھوں نے کئی سال تک نہایت دشوار گزار علاقوں میں سفر کر کے ٹھوس اصولوں کی بنیاد پر تحقیق کی تھی اور یہ تحقیق ایک کتاب کی صورت میں شائع بھی ہوئی تھی۔ یہ کتاب اس تہذیب پر تب تک کا حرف آخر تھی۔ اس میں انھوں نے آشوروں کے پاس سے ملنے والی متعدد اشیا اور ان پر آشوری زبان میں درج باتوں کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس معاملے میں انھیں غیر معمولی تحقیق اور جاں فشانی سے کام لینا پڑا۔ قدیم تہذیبوں کے بارے

میں کچھ بھی لکھنے کے لئے بہت وقت، محنت اور صلاحیت درکار ہوا کرتی ہے۔ اس معاملے میں ڈاکٹر ہائنرچ بہت خوش نصیب واقع ہوئے تھے۔ ان کی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری تھی اور اس بات کو دنیا تسلیم بھی کرتی تھی۔ مگر اس سے بڑی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر ہائنرچ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں پر پوری نظر رکھتے تھے اور اگر کہیں کوئی خامی یا کمی ہوتی تھی تو وہ اسے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اگر ایسا کرنے میں ناکام رہتے تھے تو اس خامی یا کوتاہی کا اعتراف کرنے میں کسی بھی درجے کے بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ خود بھی مصریات کے ماہرین میں سے تھے۔ اور اس حوالے سے لوگ ان سے مشورے طلب کیا کرتے تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے پتھر کے دو ٹکڑوں پر درج ایک جملے کا ترجمہ اصل مسودے میں شامل نہیں کیا کیونکہ اس کا مستند ترجمہ ان سے نہیں ہو پا رہا تھا! وہ اگر چاہتے تو اپنے علمی مرتبے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ کہتے اور اسے مستند سمجھ لیا جاتا مگر ان کی ایمانداری انہیں ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ اس معاملے میں وہ کسی کو بے وقوف بنانے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

اس دن انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اگر ترجمہ ہوا تو ٹھیک ورنہ اگلے دن مسودہ پبلشر کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ مسودے پر آخری نظر ڈال رہے تھے۔ ایک طرف تو خشک موضوع اور دوسری طرف تھکن! نیند آ رہی تھی مگر وہ سونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انہیں نہ جانے کیوں اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس آشوری الفاظ کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مسز ہائنرچ سونے چلی گئیں تو وہ اپنی اسٹڈی میں مسودے کا جائزہ لیتے رہے اور اسی عالم میں انھیں نیند آ گئی یا یوں کہئے کہ انھوں نے شدید غنودگی کے دریا میں ڈبکی لگا لی۔

اور ایسے میں انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ یہ خواب کسی فلم کی مانند تھا۔ اس خواب میں انھوں نے اپنے آپ کو قدیم بابل شہر میں پایا۔ وہ اس ویران شہر کی جانی پہچانی عمارات کے درمیان ایک مذہبی عالم کی معیت میں کھڑے تھے۔ پہلے تو انھیں اس دیو قامت شخص سے بڑا خوف محسوس ہوا مگر جب اس نے اشارے سے انہیں اپنے پاس بلایا تو ان کا سارا خوف دور ہو گیا۔ وہ انھیں ساتھ لے کر مختلف عمارات سے گزرتا ہوا شہر کے مرکزی معبد میں داخل ہوا۔ اس معبد کے سب سے بڑے ہال میں انھیں ایک بہت بڑی مورتی کے سائے میں وہی ستون دکھائی دیا جس کے دو ٹکڑوں پر لکھے ہوئے جملوں کا ترجمہ کرنے کی وہ کوشش کر رہے تھے!

وہ سکتے کی سی حالت میں اس ستون کو دیکھتے رہے۔ یہاں انھیں وہ ستون مکمل حالت میں

دکھائی دے رہا تھا۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس ستون کو بھی کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ اور ڈاکٹر ہائنرچ کے پاس جملہ ادھورا تھا۔ یہاں، خواب میں وہ اس جملے کو مکمل حالت میں دیکھ رہے تھے۔ اب صرف ایک مرحلہ رہ گیا تھا، اس جملے کا ترجمہ کرنا! یہی سب سے دشوار مرحلہ تھا۔

بابل شہر کے اس مذہبی عالم کی مدد سے ڈاکٹر ہائنرچ نے خواب میں ہی لفظ "nebuchadnezzer" کا ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ اس قدر درست تھا کہ برسوں بعد مصریات کے ماہرین نے اس امر کی تصدیق بھی کر دی۔ عام طور پر ماہرین اس لفظ کا ترجمہ ''نیبو! میرے اعمال کی حفاظت کر۔'' کیا کرتے تھے، مگر اس مذہبی عالم نے خواب میں بتایا کہ اس لفظ کا درست ترجمہ یوں ہوگا، ''نیبو! ہماری سرحدوں کی حفاظت فرما۔''

جہاز، بھائی اور ''فیملی''

وہ بڑی گہری نیند میں تھا کہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی ماں پاس ہی سو رہی تھی۔ یہ بات ممتا کو کیونکر معلوم نہ ہوتی کہ اس کا بیٹا پریشان ہے؟ وہ بھی اٹھ گئی۔ لڑکا مارے خوف کے کانپ رہا تھا اور چند ہی لمحوں میں پسینے میں ڈوب گیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ اس نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا تھا۔ اس خواب میں وہ ایک جہاز کا کپتان تھا اور اس حیثیت میں اس نے ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچایا تھا اور اس جہاز پر اس کا بھائی ٹامس بھی سوار تھا!

اگر دس بارہ سال کا کوئی لڑکا ایسا خواب دیکھے تو اس کے حواس پر کیا بیتے گی؟ بس، وہی کچھ ایڈرین کریچین پر بھی بیتی۔ وہ کئی دنوں تک بخار میں مبتلا رہا۔ کبھی بخار تیز ہو جاتا اور کبھی اتر جاتا۔ نشیب و فراز کے ان مراحل نے اسے بہت دبلا کر دیا۔ مگر خیر وہ صحت یاب تو ہو گیا۔

جس خواب کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ اس نے 1833 میں دیکھا تھا۔ چھ آٹھ ماہ بعد اس نے یہی خواب دوبارہ دیکھا۔ اس مرتبہ بھی واقعات کی وہی ترتیب تھی جو پچھلے خواب میں تھی۔ لاکھ سوچنے پر بھی ایڈرین کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اس خواب میں اس کے لئے کیا پیغام ہے۔ اس کا گھرانہ کٹر کیتھولک عیسائی تھا۔ اس کی ماں وظائف میں مشغول رہا کرتی تھی۔ اس خوش عقیدہ عورت نے دو ایک پادریوں سے بھی اس خواب کا تذکرہ کیا مگر وہ بھی کوئی ایسی بات نہ بتا سکے جس سے خواب کی تعبیر کی راہ ہموار ہو سکتی۔ کہیں یہ واقعہ ذہن سے غائب نہ ہو جائے اس خیال

سے ایڈرین کی ماں نے ایک بائبل کے حاشیے پر خواب کی جزئیات لکھ لیں۔

ایڈرین نے یہی خواب چند ماہ کے وقفے سے تین سال میں چھ مرتبہ دیکھا۔ اور پھر اس نے اسے اہمیت دینا چھوڑ دیا۔ گھر والوں کے لئے اب یہ خواب کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں رہا تھا۔

47 سال بعد یعنی 1880 میں ایڈرین نے وہی خواب پھر دیکھا۔ اب 65 سال کا جہاندیدہ جہاز راں تھا۔ اور اس مرتبہ اسے ایسا لگا جیسے اسے اپنے ''فیورٹ'' خواب کی تعبیر ملنے والی ہے۔ اتنے طویل عرصے کے وقفے کے بعد جب اس نے وہ خواب دیکھا تب وہ ''برٹش انڈیا'' نامی جہاز کے کپتان کی حیثیت سے اپنے کیبن میں آرام کر رہا تھا۔

دن کا وقت تھا۔ سمندر پرسکون تھا۔ جہاز آسٹریلیا کے شہر سڈنی کی بندرگاہ سے نکل کر رنگون (برما) کی جانب رواں تھا۔ سمندر میں بظاہر کہیں کوئی خرابی نہیں تھی۔ موسم کی کیفیت دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہیں کوئی ایسی ویسی بات ہو سکتی ہے۔ مگر ایڈرین کو بہت بے چینی تھی۔ نصف صدی پرانے خواب کو دیکھنا اس کے لئے تھوڑی سی تشویش کا باعث بنا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اس کی طبیعت میں اضمحلال تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کچھ دیر آرام کرے۔ آرام کی غرض سے وہ اپنے کیبن میں چلا گیا۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ تھوڑی سی نیند نہیں لے گا اس کی طبیعت کی گرانی دور نہیں ہوگی۔ تھوڑی بہت ذہنی کشمکش کے بعد نیند آ ہی گئی۔ اور اس نے شام کے لمحات میں وہی خواب پھر دیکھا۔ اس مرتبہ فرق صرف یہ تھا کہ اسے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لفظ **family** بھی لکھا ہوا ملا۔ اب بھی وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ خواب کیا تھا اور **family** کا مطلب کیا تھا۔ ایک دن میں دو مرتبہ نصف صدی پرانے خواب کا دیکھنا اس کے لئے اس قدر پریشانی کا باعث بنا کہ اسے بخار سا آ گیا!

فریش ہونے کے بعد وہ عرشے پر آیا۔ وہاں خاصی رونق تھی۔ لوگ موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پرسکون پانیوں میں سفر جاری تھا۔ ایسے میں ایڈرین نے نہ جانے کس خیال کے تحت حکم دیا کہ جہاز کو اس کے طے شدہ راستے سے ہٹا کر ذرا سا شمال مشرق کی سمت چلایا جائے۔

یہ فیصلہ بہت حیران کن تھا کیونکہ بظاہر ایسا کرنا قطعی بے بنیاد تھا۔ جس راستے پر جہاز کو ڈالا

جا رہا تھا وہ پہلے سے طے شدہ نہیں تھا۔ اس کے ماتحتوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی اور انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کرنے میں دیر بھی نہیں لگائی۔ ایڈرین انہیں کیا بتاتا۔ اسے تو خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس اندازے کے تحت یہ سمت تبدیل کروا رہا ہے۔ مگر اس بات کا اندازہ اسے ضرور تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے اور اس کے اس اقدام کا اچھا ہی نتیجہ برآمد ہوگا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا۔

طے شدہ راستے سے ہٹ کر یہ لوگ سمندر کے جس حصے میں گئے تھے وہاں سمندر ذرا بپھرے ہوئے موڈ میں تھا اور ایک جہاز ڈوبنے کو تھا۔ اس پر 269 افراد سوار تھے۔ ایک ایک فرد کو بچا لیا گیا۔

جہاز کا نام **FAMILY** تھا!

اس جہاز کے تمام مسافر خوش تھے کہ آبی موت سے بچ گئے۔ اور ''برٹش انڈیا'' کا عملہ بھی بہت خوش تھا کہ اس نے اتنی بڑی تعداد بھی زندگیاں بچائیں۔

ایک کونے میں ایڈرین گم سم کھڑا تھا۔ اس کی تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ اس کا خواب سچ ثابت ہوا تھا۔ اور اس بات کی بہت خوشی تھی کہ اس نے بروقت پہنچ کر سیکڑوں افراد کو بچا لیا تھا۔ مگر پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں دھماکہ ہوا۔

ٹامس کہاں ہے؟

اس نے بے تابی سے سوچا۔

اگر خواب سچا ہے تو مکمل طور پر سچا ہوگا!

اس نے **FAMILY** کے عملے سے ٹامس کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو انہوں نے لاعلمی ظاہر کی مگر جب ایڈرین نے زور دیا تو انہیں یاد آیا کہ اس نام کا ایک بوڑھا جہاز کے عرشے پر ایک کیبن میں سویا ہوا تو تھا مگر پھر کون جانے کہ اس کا کیا ہوا۔

ایڈرین نے ایک نظر اس جہاز پر ڈالی جو ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا! اس میں کئی سوراخ ہو چکے تھے۔ اور رفتہ رفتہ اس میں پانی بھرتا جا رہا تھا۔

یہ جہاز میرے بھائی کے ساتھ کیسے ڈوب سکتا ہے؟ ایڈرین نے سوچا۔ اس نے حکم دیا کہ ڈوبتے ہوئے جہاز کے عرشے کے تمام کیبنوں کی تلاشی لی جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔

اور یہ دیکھ کر سب حیرت زدہ رہ گئے کہ ایک کیبن میں ٹامس گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہا

تھا!

جہاز کو خالی کرایا گیا اور اسے خبر تک نہ ہوئی! یہ بھلا کیسے ممکن تھا؟ یہ تو افراتفری کا وقت ہوتا ہے اور ایسے میں ہڑبونگ مچتی ہے تو شور شرابہ بھی بہت ہوتا ہے۔ ایسے شور شرابے میں تو مردوں کی بھی نیند اڑ جاتی ہے!

بات یہ تھی کہ دو دن سے ٹامس کی طبیعت بہت خراب تھی۔ بے چینی اتنی زیادہ تھی کہ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے پرسکون نیند کے لئے تین خواب آور گولیاں حلق سے اتاریں اور کمبل اوڑھ کر اپنے کیبن میں لیٹ گیا۔ اور اس کے بعد کیا ہوا اسے اس کا کچھ علم ہی نہ ہوا۔

اگر ایڈرین امدادی جہاز پر موجود نہ ہوتا تو ٹامس کا بچنا ناممکن تھا کیونکہ سب اسے بھول چکے تھے۔ ایک خواب نے تعبیر سے ہمکنار ہو کر ایک زندگی بچائی۔

ایک گیت......ڈوبنے والوں کے لئے!

ریورینڈ مورگن کے لئے وہ عام سا دن تھا۔ ان کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ شام کی سروس کے لئے میوزک ڈائریکٹر جو نظمیں یا گیت منتخب کرے ان کی فہرست بلیٹن بورڈ پر چسپاں کر دیا کریں۔ وہ اس کام میں خاصے "ماہر" ہو چکے تھے اور اب تو وہ خود بھی بہت سی چیزیں منتخب کر کے میوزک ڈائریکٹر کو دیا کرتے تھے اور وہ بھی بہت خوش تھا کہ اس صورت میں اس کا کام آسان ہو گیا تھا۔

ریورینڈ مورگن روز ڈیل میتھڈسٹ چرچ، ونی پیگ (کینیڈا) کے ایک اعلیٰ عہدیدار تھے۔ اس چرچ میں مذہبی فرائض انجام دیتے ہوئے انہیں دس سال بیت چکے تھے اور اس دوران چونکہ انہوں نے بڑی باقاعدگی سے pastor کا فریضہ بھی انجام دیا تھا اس لئے انہیں وہ تمام گیت ازبر ہو چکے تھے جو شام کی سروس میں گائے جاتے تھے۔ ان میں سے چند گیت تو اتنے اچھے تھے کہ جب بھی ریورینڈ مورگن تنہائی کے چند لمحات پاتے تھے تو انہیں گا کر اپنا جی بہلانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک موزوں طبیعت کے مالک تھے اور کبھی کبھی خود بھی مختصر سے گیت لکھ لیتے تھے۔ ان میں سے دو تین گیت چرچ میں گائے ہی نہیں گئے تھے بلکہ پسند بھی کئے گئے تھے۔

اس دن بھی انہوں نے میوزک ڈائریکٹر سے گیتوں کی فہرست لی اور بلیٹن بورڈ پر چسپاں کر دی۔ اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئے۔ اس دن تھکن کچھ زیادہ تھی اس لئے بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی اور نیند جب ذرا گہری ہوئی تو انہوں نے ایک خواب دیکھا۔ یہ خواب بہت عجیب و غریب تھا۔ اس خواب میں انہیں ایک بہت پرانا گیت سنائی دے رہا تھا مگر گانے والے نظروں سے اوجھل تھے۔ اس گیت کو تھوڑے سے پراسرار انداز سے گایا جا رہا تھا۔ پس منظر میں کئی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں اور بہت دور سے پانی کے گرنے اور پھر موجوں کے زور پکڑنے کا تاثر ابھر رہا تھا۔ یہ سب کچھ بہت عجیب تھا۔ خواب کے دوران ریورینڈ مورگن نے بہت کوشش کی کہ گانے والوں کو دیکھ سکیں مگر ناکام رہے۔ اس گیت کو روز ڈیل میتھڈسٹ چرچ میں کئی بار گایا جا چکا تھا اس لئے دیگر بہت سے گیتوں کی مانند یہ بھی انہیں ازبر تھا۔

آنکھ کھلی تو ریورینڈ مورگن نے اپنے آپ کو پسینے میں شرابور پایا۔ وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ کبھی کبھی خواب سچے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ انہوں نے خود کئی مرتبہ خواب میں جن باتوں کو ہوتے ہوئے دیکھا تھا بعد میں وہی باتیں حقیقی زندگی میں بھی رونما ہوئی تھیں۔ اس خواب کے حوالے سے سب سے پیچیدہ بات یہ تھی کہ اس میں گانے والے دکھائی نہیں دے رہے تھے اور یہ کہ یہ بھی واضح نہیں ہو پا رہا تھا کہ گیت کیوں گایا جا رہا تھا۔ ہر گیت کا کوئی نہ کوئی موقع ضرور تھا اور اس گیت کا بھی ہوگا مگر ریورینڈ مورگن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس گیت کو پیش کرنے کا محل کیا تھا؟ بہت سوچنے پر بھی جب یہ عقدہ وا نہ ہوا تو انہوں نے سوچا کسی کو یہ خواب سنا کر کیا پریشان کرنا! جب میں ہی سمجھنے سے قاصر رہا ہوں تو کوئی اور کس طرح سمجھے گا! انہوں نے کسی سے خواب کا تذکرہ نہیں کیا اور شام کی سروس کا انتظار کیا۔

شام آئی اور اس طرح آئی کہ ایک قیامت کو ساتھ لائی۔ چرچ میں شام کی دعا ہوئی۔ وہی گیت گائے گئے جو پہلے سے طے شدہ تھے۔ اس میں ایک آسانی تھی۔ لوگوں کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ کس دن کیا گانا ہے اور یوں وہ ذہنی تیاری کے ساتھ آتے تھے۔ اس ذہنی تیاری کے طفیل وقت کو ضائع ہونے سے بچانا ممکن ہو جاتا تھا۔ گیتوں کے شیڈیول کو تبدیل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے چرچ کی اعلیٰ انتظامیہ سے باضابطہ اجازت لینی پڑتی تھی۔ مگر ہاں، یہ ممکن تھا کہ جب پہلے سے طے شدہ گیت ختم ہوں تو خصوصی طور پر درخواست کر کے کوئی گیت گایا جائے اور یوں اس کی بات رہ جاتی تھی جو اس گیت کو سننے کا خواہش مند ہوتا تھا۔

ریورینڈ مورگن چاہتے تھے کہ اس شام کی سروس میں وہ گیت بھی گایا جائے جو انہوں نے خواب میں دیکھا...... یا یوں کہئے کہ سنا تھا۔ انہوں نے شرکا سے جب اس سلسلے میں درخواست کی تو ان کی درخواست کو کسی نے مسترد نہیں کیا کیونکہ یہ گیت بہت مقبول ہونے کے باعث بہت سوں کو از بر تھا۔

ریورینڈ مورگن کی فرمائش یا استدعا کے مطابق گیت شروع ہوا اور سب نے آواز میں آواز ملانا شروع کیا۔ اس گیت میں ایک عجیب جادو کی سی صفت تھی۔ جو اسے سنتا یا گاتا تھا اس پر اس کا اثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ جوں جوں گیت آگے بڑھ رہا تھا، اس کا جادو جوان سے جوان تر ہوتا جا رہا تھا۔ سب اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ آج کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ سب کے دل میں ایک عجیب سی بے قراری تھی۔ مگر اس کا سبب کوئی بھی نہیں جان پا رہا تھا کیونکہ انہیں کچھ اندازہ ہی نہیں تھا۔ اس بات کا احساس ضرور تھا کہ کچھ نہ کچھ ہے جو بہت جلد سامنے آئے گا۔

جب یہ گیت گایا جا رہا تھا تب کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ لوگ ایک بہت بڑے واقعے کی، ایک عظیم سانحے کی گواہی دے رہے ہیں!

گیت میں ان لوگوں کے لئے رحم و کرم کی دعا کی گئی تھی جو گہرے پانیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

اس گیت کے بول یہ تھے......

Hear, Father, while we pray to Thee

for those in peril on the sea!

یہ 14 اپریل، 1912 کی سہانی شام تھی۔ مگر یہ شام سہانی ان کے لئے تھی جو ونی پیگ، کینیڈا کے روز ڈیل میتھڈسٹ چرچ کے اس وسیع و عریض اور ہوادار ہال میں کھڑے تھے۔

جس وقت یہ گیت گایا جا رہا تھا عین اسی وقت بحری تاریخ کا ایک عظیم المیہ جنم لے رہا تھا۔ اور جو لوگ اس عظیم المیے کا ایک حصہ بننے والے تھے ان کے لئے۔ یقیناً یہ شام سہانی ہرگز نہیں تھی۔

اس گیت کے گائے جانے کے وقت شمالی بحر اوقیانوس میں اپنے وقت کا سب سے بڑا بحری جہاز TITANIC ڈوب رہا تھا!

جب اس سانحے کی خبریں آئیں تو لوگوں نے ریورینڈ مورگن سے رابطہ قائم کیا۔ جن

لوگوں نے اس شام گیت میں حصہ لیا تھا وہ سکتے کی سی حالت میں تھے۔

وہ گیت ایک عظیم سانحے کی گواہی کے لئے گایا جا رہا تھا!

ان کے دل و دماغ کی عجیب حالت تھی۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے کے ہی وقت انہیں اس گیت کے گانے میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اور یہ سب ریورینڈ مورگن کی مہربانی تھی۔ سب ان کا شکریہ ادا کر کے اس سانحے پر افسوس کا اظہار بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر جس انسان کے پاس وہ آئے تھے وہ تو خود اپنے آپ سے بہت دور کسی دوسری دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ کئی دن تک ریورینڈ مورگن کی عجیب حالت رہی۔ مگر مرتے دم تک انہیں اس بات کا اطمینان بھی رہا کہ انہوں نے ایک عظیم سانحے کے لئے یادگار گیت گایا۔

برف کے مکین کہاں گئے؟

برفانی علاقوں کے مکین اسکیمو کہلاتے ہیں۔ ان کے مکانات اگلو کہلاتے ہیں۔ اسکیمو سخت نامساعد حالات میں زندگی گزارتے ہیں اور دیکھا گیا ہے ان کے لئے موسم اور حالات کی سختیاں بڑھتی ہی رہتی ہیں، کم نہیں ہوتیں۔ اگر نارمل دنیا کا کوئی انسان ان کے معمولات کا جائزہ لے تو اسے یقین ہی نہیں آئے گا کہ اس قدر دشوار زندگی بھی گزاری جاتی ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ وہ طرح طرح کے حالات اور ان میں زندگی گزارنے والے لوگ پیدا کرتی ہے۔

قطب شمالی کے علاقے میں ماؤنٹیز بیس کے نزدیک اسکیموز کے ایک گاؤں کے تمام مکین اس طرح غائب ہوگئے کہ آج تک ان کا سراغ نہیں مل سکا۔

اس واقعے کو اب تقریباً 70 سال گزر چکے ہیں۔ یہ نومبر 1930 کی بات ہے۔ جو لیبیل اس علاقے میں تحقیق پر مامور تھا اور بہت بڑے رقبے پر محیط علاقے میں گھومتا پھرتا تھا۔ اس کے کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اسے ایک وسیع رقبے پر محیط علاقے کی خاک چھاننی پڑتی تھی۔ کئی اسکیمو اس کے دوست تھے۔ ان میں کچھ وقت گزارنا اسے اچھا لگتا تھا۔ ان کی رسوم میں وہ بہت دلچسپی لیتا تھا اور ان میں گم ہو کر وہ کچھ دیر کے لئے اپنے ماحول کو بھول جاتا تھا۔ وہ دو تین ماہ میں ایک بار تین چار دنوں کے لئے ان میں رہ آیا کرتا تھا۔ اسکیموز کے ایک گاؤں میں اکثر اس کا آنا جانا رہتا تھا۔ یہ گاؤں انجیکونی نامی جھیل کے کنارے آباد تھا۔ اس کے مکینوں کی تعداد بیس اور تیس کے درمیان تھی۔

ایک بار جو کو ان سے ملے کئی ماہ گزر گئے تو ایک دن سیر کرتے کرتے اس طرف جا نکلا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ گاؤں تو سراسر ویران پڑا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ شاید مرد

شکار کے لئے گئے ہیں مگر وہاں تو کوئی عورت اور بچہ بھی نہیں تھا۔ اس نے پورے گاؤں کا چکر کاٹا مگر اسے کہیں کوئی کتا بھی دکھائی نہیں دیا۔ اور نہ ہی کہیں سے کوئی آواز آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے گاؤں کی پوری آبادی کو اٹھا کر کہیں منتقل کر دیا تھا۔ یہ صورت حال بہت پراسرار اور اچھی خاصی حد تک خوفناک تھی۔

جو لیبیل جب یہ دیکھا کہ وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت نہی رکھتا تو اس نے ب تو اس نیئے نارتھ ویسٹ ماؤنٹیڈ پولیس کو اس صورت حال کی اطلاع دی۔ اسے بھی یہ بات بہت حیران کن محسوس ہوئی۔ یہ بھلا کس طرح ممکن تھا کہ کسی گاؤں کی پوری کی پوری آبادی اپنا سامان لئے بغیر غائب ہو جائے؟ جب گاؤں کا جائزہ لیا گیا تو چند انتہائی حیرت انگیز باتوں کا سراغ ملا۔ تمام جھونپڑیوں میں رائفلز سلامت تھیں۔ کسی اسکیمو کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کہیں جائے اور اپنی رائفل گھر پر چھوڑ جائے۔ برفانی علاقوں میں رائفل ایک حد تک لائف انشورنس پالیسی کی مانند ہوتی ہے۔ ایسے میں یہ بات انتہائی حیرت انگیز تھی کہ گاؤں کے تمام افراد غائب تھے اور ان کی رائفلز سلامت تھیں۔ کئی ماہ سے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے اور ان پر چڑھے برتنوں میں سالن کے آثار ابھی تک سلامت تھے۔ دو ایک جھونپڑیوں کا باریکی سے جائزہ لیا گیا تو اندازہ ہوا کہ جیسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک کوئی طاقت آئی اور ان کے سارے کام ادھورے رہ گئے۔ ایک جھونپڑی میں کسی سمندری جانور کی کھال کے بنے ہوئے لباس کو درست کیا جا رہا تھا اور اس میں ہاتھی دانت کی بنی ہوئی سوئی ابھی تک گڑی ہوئی تھی!

ایسا کیا ہوا کہ سب کو اچانک یوں اپنے کام ادھورے چھوڑ کر جانا پڑا؟ بہت سوچنے پر بھی جو کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ رائفل کی طرح اسکیمو کی زندگی میں کتوں کی بھی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ شکار پر کتوں کے بغیر نہیں جایا کرتے۔ مگر گاؤں کے تمام کتے بھی وہاں نہیں تھے۔ جائزہ لینے پر وہ ڈیڑھ سو گز دور کسی درخت کے تنے سے رسیوں کے ذریعے بندھے ہوئے ملے۔ وہ بھوک کے مارے ہلاک ہوئے تھے۔ یہ بات بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ کتوں کو اس طرح باندھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ قریب ہی ایک قبر بھی واقع تھی جس میں ایک اسکیمو کو قبائلی رسوم کے مطابق دفن کر کے اس پر بڑے بڑے پتھر رکھے گئے تھے مگر وہ قبر بھی خالی

تھی۔ لاش یا اس کی باقیات کو بڑی نفاست سے نکال کر پتھروں کو احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔ اسکیموز سے اس حرکت کی توقع رکھنا فضول تھا اور کتوں یا دوسرے پالتو جانوروں میں اتنا دم نہیں تھا کہ ان پتھروں کو ہلا بھی سکتے۔

پولیس نے بہت کوشش کی مگر جانے والوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ قدموں کے نشانات کی مدد سے راستوں کی نشاندہی کرنے والوں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں مگر وہ بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ بالآخر پولیس نے اس کیس کو ایک ادھورا کیس قرار دے کر فائل بند کر دی۔

ٹیلی مواصلات کی جنگ کا گمنام سپاہی

کون ہے جس نے مارکونی کا نام نہیں سنا؟ اسے ریڈیائی لہروں کے موجد یا دریافت کنندہ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ایک عام آدمی کے لئے مارکونی ریڈیو کا موجد ہے۔ ریڈیو ایسی ایجاد ہے جس نے انسانی زندگی میں انقلاب بپا کیا ہے اور آج ہم ٹیلی کمیونی کیشن کے حوالے سے عقل کو حیران کر دینے والی جو ترقی دیکھتے ہیں وہ ریڈیو کی ایجاد سے ہی ممکن ہو سکی۔ جس زمانے میں ریڈیو ابھی اپنی ابتدائی شکل میں تھا، اسے لوگ بہت حد تک جادوگری کے ایک نمونے کی حیثیت سے قبول کرتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک تو دیہاتی اور دوسرے ناخواندہ افراد یہی سمجھتے رہے کہ یہ کوئی جادو کی چیز ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کی سوچ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ ہم نے ہوش سنبھالتے ہیں بہت سی حیرت انگیز چیزوں کو زندگی کا حصہ پایا ہے اس لئے ہمیں ان کی موجودگی پر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوتی۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ جن لوگوں کی زندگی میں کوئی بھی بے تار چیز نہ رہی ہو وہ ٹیلی فون یا ریڈیو جیسی چیزوں سے کس قدر مرعوب ہوئے ہوں گے اور ان چیزوں نے ان کی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب بپا نہ کئے ہوں گے؟

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ ریڈیائی لہروں کو مارکوئی سے پندرہ بیس سال قبل ایک امریکی باشندے نیتھن اسٹبل فیلڈ نے دریافت کیا تھا اور اس نے اس کے کئی عملی مظاہرے بھی کئے تھے! مگر اس کے باوجود آج بہت کم بلکہ بہت ہی کم لوگ اسے جانتے ہیں۔

اسٹبل فیلڈ نے بہت سے لوگوں کو بے تار آلے کی مدد سے اپنی آواز سنوائی تھی۔ وہ کینٹکی (امریکہ) کا رہنے والا تھا۔ 1892 میں اس نے پہلی مرتبہ بے تار آلے کی مدد سے آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا تجربہ کیا تھا۔ اور اس کامیاب تجربے کو سیکڑوں افراد نے دیکھا تھا اور ان کی حیرت کی کوئی انتہا بھی نہ رہی تھی۔ ان کے لئے یہ سب بہت حیرت انگیز تھا۔ وہاں

جتنے بھی لوگ موجود تھے انہیں اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ زندگی بھر انہوں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی اس لئے ذہن اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا! کچھ دیر کے لئے تو ہر شخص اپنی جگہ مبہوت کھڑا رہا اور کسی کے بھی ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ اس پر کیا ردعمل ظاہر کرے۔ اٹبل فیلڈ بہت خوش تھا کہ اس نے لوگوں کے ذہنوں کو ماؤف کر دیا تھا۔

جب ذہن پر سے حیرت کی گرد چھٹی تو لوگوں کو خیال آیا کہ انہیں اسٹبل فیلڈ نے مبہوت کیا تھا۔ وہ ان کے سامنے کھڑا تھا اور داد وتحسین کے ڈونگرے برسائے جانے کا منتظر تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اتنا تو اس کا حق تھا مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ لوگوں نے اس کے ٹیلینٹ کی داد دینے کی بجائے اسے hoot کرنا شروع کر دیا۔ یہ تو واقعی ستم ظریفی تھی۔ مگر اس میں بہت حد تک اس کا اپنا قصور بھی تھا۔ اس نے جاہلوں کے سامنے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا اور جاہلوں سے جو رد عمل متوقع ہوسکتا ہے وہی ردعمل وہ دکھا رہے تھے۔ وہاں موجود لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اس دور کی سائنسی ایجادات کو بھی جادو کا حصہ سمجھتے تھے اور انہیں اپنی عقل کے دائرے میں داخل کرنے سے گریز کرتے تھے۔

اسٹبل فیلڈ کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ لوگ اس کی صلاحیتوں کی داد دینے کی بجائے اس پر ہوٹ کریں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔ اس نے چاہا کہ اپنے کمال کے بارے میں سائنسی توجیہ سے لوگوں کو مطمئن کرے مگر کوئی اس کی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ کوئی اس کی مہارت کا راز جاننے کے بارے میں سنجیدہ نہیں تو اس نے اپنے آلات ویگن میں ڈالے اور اناپ شناپ بکتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

مرے، کینٹکی کے کورٹ ہاؤس لان کا وہ واقعہ اسٹبل فیلڈ کے لئے ایک بھیانک خواب کی مانند تھا۔ اسے بہت غصہ آیا کہ کوئی اس کے ٹیلینٹ کی قدر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ سب نے دیکھا تھا کہ اس نے کسی بھی تار کا سہارا لئے بغیر اپنی آواز 200 فٹ کے فاصلے پر واقع ریسیور تک پہنچادی تھی مگر اس کے باوجود اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا گیا۔ اس سلسلے میں اسٹبل فیلڈ نے ٹیلی فون کے ریسیور استعمال کئے تھے۔ وہ ٹیلی فون میکینک تھا اور اس آلے کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ برقی مقناطیسی لہروں کے اثرات سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آواز لہروں کی شکل میں سفر کرتی ہے۔

مرے کے کورٹ ہاؤس لان میں اسٹبل فیلڈ نے جو تجربہ کیا تھا اس کی سن گن ''سینٹ لوئی پوسٹ ڈسپیچ'' کو بھی ملی۔ یہ اخبار حیرت انگیز واقعات کی کوریج کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر نے اسٹبل فیلڈ کو خط لکھا اور اس کی صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسٹبل فیلڈ نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ایڈیٹر نے ایک رپورٹر کو روانہ کیا۔ 10 جنوری 1902 کو اسٹبل فیلڈ نے مذکورہ اخبار کے رپورٹر کے سامنے اپنی صلاحیتوں کا کامیاب مظاہرہ کیا اور اس بار اس نے ایک میل کے دائرے میں اپنی آواز کسی تار کے بغیر ریسیور تک پہنچائی۔ اس نے رپورٹر کو ایک ریسیور دیا جو چار فٹ کے ایک rod سے جڑا ہوا تھا۔ اس راڈ یا سلاخ کو زمین میں گاڑ کر ریسیور کان سے لگانے پر آواز سنائی دیتی تھی۔ رپورٹر بہت متاثر ہوا اور اس نے اس کارنامے کو اپنی رپورٹ میں بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور یوں ایک بار پھر لوگ اسٹبل فیلڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔

نیتھن اسٹبل فیلڈ نے بتایا کہ وہ کوئی جادوگر نہیں بلکہ دراصل اس برقی میدان یا electro-field کو استعمال کر رہا ہے جو زمین اور فضا کی ہر چیز پر محیط ہے۔ اس نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن آئے گا جب ملک بھر کے لوگ موسم کا حال کسی ریسیور کی مدد سے دارالحکومت سے براہ راست سنیں گے۔ اسی طرح انہیں دنیا بھر کی موسیقی گھر بیٹھے سننے کو ملے گی۔ اور بہت کم عرصے میں اس کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔

اسٹبل فیلڈ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں جب فلاڈیلفیا کے دولت مند تاجروں اور صنعت کاروں نے سنا تو اسے بلایا اور اس سے فرمائش کی کہ اپنی ایجاد کا عملی مظاہرہ ان کے سامنے بھی کرے۔ اسٹبل فیلڈ نے موقع غنیمت جانا اور اپنا سامان لے کر فلاڈیلفیا گیا جہاں اس نے مئی 1902 میں وہی تجربہ کامیابی سے مکمل کیا جو وہ اس سے قبل تین چار مرتبہ کر چکا تھا۔ کسی بھی نئی چیز سے فائدہ اٹھانے کے لئے بے چین رہنے والے سرمایا کار اس کے ٹیلینٹ سے بہت متاثر ہوئے۔ ورجینیا میں پوٹو میک کے ساحل پر اس نے ایک آلہ زمین میں نصب کیا اور ریسیور ایک جہاز میں سوار سرمایا کاروں کو دے دیا۔ اس کا بھیجا ہوا پیغام سمندر میں دور تک بہت واضح سنائی دیا۔

جب سان فرانسسکو اور شکاگو کے صنعت کاروں اور سرمایا کاروں کے علاوہ واشنگٹن کے سائنس دانوں نے بھی اسٹبل فیلڈ سے اس کے آلات خریدنے کی بات کی تو وہ راتوں رات

آنے والی ان آفرز سے گھبرا گیا اور اس نے سوچا کہ اس طرح اس کا آئیڈیا صرف اس کا نہیں رہے گا۔ وہ کسی بھی حالت میں اپنی اس ایجاد سے دستبردار ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ لوگ اس کے ٹیلنٹ کا احترام کریں اور اسے اس کا حق دیں مگر اسے دال میں کالا دکھائی دینے لگا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے سے زیادہ لوگ اس بات میں دلچسپی لے رہے ہیں کہ وہ اپنی اس ایجاد یا دریافت سے کنارہ کش ہو کر دوسروں کو یہ سونپ دے تاکہ وہ اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ کچھ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ کینٹکی کا کوئی ان پڑھ کسان بے تار پیغام بھیج کر اپنا نام روشن کرلے! اس میں ان سائنس دانوں کے لئے سبکی کا سامان تھا جو رات دن طرح طرح کے تجربات میں مصروف رہا کرتے تھے۔ انہیں یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر اسی طرح ناخواندہ لوگ حیرت انگیز ایجادات اور دریافتوں کے ساتھ سامنے آتے رہے تو لوگ انہیں (سائنس دانوں) تنقید کا نشانہ بناتے رہیں گے۔ اس نے درجنوں سائنس دانوں پر اپنے صلاحیتوں کو ثابت کیا اور یوں اس سے حسد کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ایجاد کسی کو فروخت نہیں کرے گا۔

بات کچھ یوں بھی ہے کہ اسٹبل اپنے ذہن میں الجھ گیا تھا اور پھر اس الجھن سے باہر آنا اسے نصیب ہی نہ ہوا۔ چند بے بنیاد باتوں نے اس کے ذہن میں گھر کر لیا تھا۔ وہ ہر وقت اس بات پر غور کرتا رہتا تھا کہ لوگ اسے کامیاب ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس محدود سوچ نے اس میں بہت سی پیچیدگیوں کو راہ دی اور اس کی ذہنی نشوونما رک گئی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ کوئی لاکھ سمجھاتا مگر وہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اس کا بہی خواہ بھی ہے۔ وہ بس اس الجھی ہوئی سوچ میں غرق رہتا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی اس کی صلاحیتوں کا قدر دان نہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ راتوں رات اس غم میں مبتلا رہتا تھا کہ کہیں کسی کو اس کے ''ٹاپ سیکریٹ'' کا علم نہ ہو جائے۔ وہ اس راز کو قبر میں لے جانا چاہتا تھا۔ اگر کوئی اس سے کچھ سیکھنے کی خواہش ظاہر کرتا تو وہ صاف انکار کر دیتا کہ کہیں وہ اس سے اس کی ایجاد کے بارے میں کوئی کام کی بات نہ جان لے۔

جب اس نے واشنگٹن میں بے تار صوتی آواز بھیجنے کا تجربہ کیا تب واشنگٹن ایوننگ اسٹار نے لکھا......

FIRST TEST OF WIRELESS TELEGRAPHY HEARD FROM A DISTANCE OF HALF A MILE. INVENTION OF A KENTUCKY FARMER. WIRELESS TELEPHONY DEMONSTRATED BEYOND QUESTION.

مگر بہت جلد اس کے لئے یہ ساری تعریف کمزور پڑنے لگی۔ اس دور میں اور بھی بہت سے لوگ اس میدان میں کام کر رہے تھے اور ان کی کاوشیں بارآور ہونے کو تھیں اور جب اسٹبل فیلڈ کو اس بات کا علم ہوا کہ اس نے جس میدان میں تحقیق کے بعد ایک آلہ ایجاد کیا تھا اور بے تار آواز نشر کرنے میں کامیاب حاصل کرلی تھی اب اسی میدان میں بہت سوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا بہت عمدگی سے منوایا ہے تو اس کے احساس کمتری میں مزید شدت آگئی۔ وہ غیر معمولی حد تک چڑچڑا ہو گیا اور بات بات پر لوگوں سے لڑنے جھگڑنے لگا۔ اس نے اپنی ایجاد کو چھپا دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس تک پہنچے۔ اسی عالم میں 1929 میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے کمرے کی تلاشی لی گئی تو اس کا ایجاد کیا ہوا آلہ غائب تھا۔ اور ریکارڈ بھی بکھرا ہوا تھا۔ اور اس کے بعد تو گمنامی بلکہ بے نامی اس کا مقدر ہو گئی۔

نیتھن اسٹبل فیلڈ نے بالکل درست کہا تھا، ''میں اپنے وقت سے نصف صدی پہلے پیدا ہو گیا ہوں۔''

مگر وقت کے اس فرق کو وہ اپنی درست ذہنی حالت کے ذریعے ختم کر سکتا تھا۔ اور اس صورت میں شاید ریڈیو کی دریافت کا سہرا اسی کے سر بندھتا۔

قصے مدفون زندگی کے!

دنیا بھر میں بہت سے مقامات پر کھدائی کے دوران ایسی چٹانیں دستیاب ہوتی رہتی ہیں جن میں کسی نہ کسی جاندار شے کے دفن ہو جانے کے آثار بہت واضح طور پر پائے جا سکتے ہیں۔ جب کسی پتھریلی چٹان [illegible] کوئی جاندار دفن ہو جاتی تھی تو وہ دراصل اسی کا ایک حصہ بن جاتی [illegible] جانداروں کو [illegible] اصطلاح Fossils کہتے ہیں۔ اردو میں [illegible] اور [illegible] کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ اور یہ فوسلز جس چیز میں بھی ہوتے ہیں ان پر اپنے نقوش چھوڑتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی پرندہ کسی چٹان میں مدفون ملے گا تو اس کا پورا وجود اس پتھر پر نقش ہو چکا ہوگا۔

سائنس دانوں کا نظریہ یہ ہے کہ فوسلز میں کوئی جاندار چیز نہیں مل سکتی کیونکہ پتھروں کی چٹانوں اور دھاتوں کی کانوں میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی جاندار ہزاروں سال کسی بھی قسم کی خوراک کے بغیر زندہ رہ سکے۔ مگر یہ بات کئی مرتبہ غلط ثابت ہو چکی ہے۔ جی ہاں، پتھروں اور خام دھاتوں میں پائے جانے والے فوسلز میں زندگی ملی ہے اور ان واقعات نے سائنس دانوں کو بھی غیر معمولی حد تک ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے۔

آپ شاید اس بات پر یقین کرنے کے لئے اپنے ذہن کو آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ذہن کو تیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب آپ ان واقعات کے بارے میں پڑھیں گے تو [illegible] لگے گا۔ کسی بھی غیر معمولی بات کو ذہن ابتدا میں قبول نہیں کرتا [illegible] تسلیم کئے جانے کے قابل ہو

بات تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے۔

22 اپریل، 1881 میں امریکی ریاست نیواڈا کے روبی ہل نامی علاقے میں جو مولینو پوری توجہ اور تن دہی سے وائٹ ویسٹ مائن میں 60 فٹ کی گہرائی میں کھدائی کرنے میں مصروف تھا [illegible] ناممکن ہو گیا۔ اس نے غصے سے اس پتھر پر بڑے ہتھوڑے سے ایک زوردار چوٹ ماری۔ پتھر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور کر [illegible] بہت غور سے دیکھا۔ وہاں بہت سے کیڑوں کے مٹے ہوئے آثار تھے۔ اس نے پتھروں میں دفن [illegible]

[illegible] ایک سپروائزر [illegible] چند دوسرے کیڑے بھی زندگی کا ثبوت پیش کرنے لگے۔ وہاں کام کرنے والوں کو یہ منظر دیکھ کر [illegible] تھا اسے جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

یہ کیڑے ایک ہفتے تک زندہ رہے اور اس دوران انہیں درجنوں افراد نے دیکھا اور حیران و محظوظ ہوئے۔ اس واقعے سے یو ایس بیورو آف مائنز کو مطلع کرنا ضروری سمجھا گیا اور مزدوروں نے ان کیڑوں کو بھی بیورو کے ماہرین کے مشاہدے کے لئے روانہ کر دیا۔

ایک ہفتے کے بعد بیورو کی جانب سے ایک خط موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ جن کیڑوں کو زندہ فوسلز کے نمونے یا ثبوت کے طور پر بھیجا گیا تھا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر قدیم دور کے تصور کر لیے گئے تھے اور یہ کہ سائنسی بنیاد پر اس بات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا! بے چارے مزدور [illegible] رہ گئے۔

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے علاقے کلفٹن کی لانگ فیلو مائن سے 1892 میں خام لوہے کے ایک بڑے چٹانی ٹکڑے کے اندرونی حصے سے ایک سرخی مائل خاکی رنگ کا کیڑا فوسل کی شکل میں ملا تھا۔ یہ کیڑا بہ ظاہر مردہ تھا۔ ایلپاسو کے علاقے میں زیڈ ٹی وائٹ نامی ایک ارضیات دان کے پاس اس فوسل کو لے جایا گیا۔ اس نے اپنی لائبریری میں رکھے ہوئے ایک جار میں اس کیڑے کو ڈال دیا۔ ایک ہفتے بعد وہ کیڑا اس جار میں حرکت کرنے لگا! وائٹ نے ایک محدب عدسے کی مدد سے اس کیڑے کا جائزہ لیا اور چند گواہوں کو بلایا اور ان سے تحریری شہادت بھی لی کہ انھوں نے اس کیڑے کو رینگتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک بڑے جار میں وہ کیڑا کئی ماہ زندہ رہا۔ مرنے پر اسے واشنگٹن کے اسمتھ سونین انسٹی ٹیوٹ بھیج دیا گیا تاکہ دوسرے لوگ بھی کائنات کو پیدا کرنے والے کی کاری گری کا ایک اچھوتا نمونہ دیکھ کر دنگ رہ جائیں!

سان فرانسسکو کے علاقے ڈایابلو میں واقع بلیک ڈائمنڈ کول مائن میں 1873 میں جب ایک بڑے پتھر کو توڑا گیا تو اس میں سے ایک مینڈک برآمد ہوا۔ وہ مینڈک وہاں بلا مبالغہ صدیوں سے تھا کیونکہ اس کا جسم اس پتھر پر منقش ہو چکا تھا۔ پہلے تو اس میں بھی زندگی کے آثار نہیں تھے مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ حرکت کرنے لگا اور یہ دیکھ کر وہاں موجود تمام افراد دنگ رہ گئے۔ وہ مینڈک ایک دن زندہ رہا۔ وہ ایک ٹانگ کو حرکت دے پاتا تھا اور محسوس کیا جاسکتا تھا کہ وہ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ جب وہ مرگیا تو اس کا مردہ جسم اور پتھر کا بنا ہوا اس کا ''مقبرہ'' سان فرانسسکو اکیڈمی آف سائنسز کو دے دیا گیا تاکہ اس پر تحقیق کی جاسکے۔

اکتوبر 1893 میں ایکٹن، اونٹاریو میں ایک بہت بڑے درخت کے تنے کو ایک بڑے مشینی آرے کی مدد سے چیرنے کی تیاری کی جارہی تھی کہ اچانک مزدوروں کو تنے کے وسط میں ایک بہت زنگ آلود سا حصہ دکھائی دیا۔ مزدور اس خیال سے رک گئے کہ کہیں یہ حصہ آرے کی زد میں نہ آجائے کیونکہ اس صورت میں بلیڈ کے خراب ہو جانے کا خدشہ تھا۔ مگر غور کرنے پر پتا چلا کہ درخت کے تنے میں جس چیز کو وہ دھات کا کوئی ٹکڑا سمجھ رہے تھے وہ دراصل کیڑوں کے

باعث سڑا ہوا ایک حصہ تھا! جب احتیاط سے تنے کے اس حصے کو چیرا گیا تو اس میں سے ایک مینڈک برآمد ہوا جسے دیکھ کر وہاں موجود بھی لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ مینڈک تنے میں 30 انچ کی گہرائی میں تھا!

ویسے فوسلز میں مینڈک کے پائے جانے کی کئی شہادتیں ریکارڈ کی جاچکی ہیں۔ اور ماہرین فوسلز کی طرح اس کی بھی کوئی وجہ معلوم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ 1829 میں جارج بیسن، لیورپول میں ایک کان کی کھدائی کے دوران جب راستہ بنانے کے لئے گرینائٹ کے ایک بہت بڑے ٹکڑے کو توڑا گیا تو اس کے اندر سے ایک زندہ مینڈک دریافت ہوا۔ اس واقعے نے بھی بہت شہرت پائی۔ یہ مینڈک چند گھنٹے ہی زندہ رہ سکا۔ اس دوران اس نے اٹھنے اور پھدکنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ مینڈک تھا تو بڑا مگر بہت کمزور تھا۔ برطانوی سائنس دانوں نے اس کا معائنہ کیا مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے بارے میں کیا رائے دی جائے!

جب انسان دیوقامت ہوا کرتے تھے!

اکثر ہمارے ذہنوں میں انتہائی قدیم زمانوں کے حوالے سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا کبھی انسان دیوقامت بھی ہوا کرتے تھے؟ اور اس سوال کا ابھرنا عین فطری امر ہے کیونکہ بہت سے قدیم صحائف میں ایسے انسانوں کا ذکر ملتا ہے جو دس بارہ بارہ فٹ کا قامت رکھتے تھے۔ انجیل کے موجودہ نسخوں میں کتاب پیدائش بھی شامل ہے جس میں کائنات کی تخلیق یعنی آفرینش کی بات کی گئی ہے۔ اس ذیل میں دیوقامت انسانوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اور آج بھی بہت زیادہ قامت والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس سے یہ خیال تقویت پاتا ہے کہ کبھی غیر معمولی قامت کے لوگ بھی زمین پر راج کرتے ہوں گے۔ اس ضمن میں ڈائنوسارز اور دیگر دیوقامت حیوانات کے بارے میں سوچنا ذہن کی بہت سی گرہیں کھول دیتا ہے۔ ڈائنوسارز انتہائی غیر معمولی قد کاٹھ کے حیوانات تھے اور اب ہم ہاتھی اور وہیل کو دیکھ کر ان کے بارے میں خیالات کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ جب ڈائنوسار اور غیر معمولی جسامت کے ہاتھی جیسے وہیل اور ہاتھی بچ سکتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ابتدائی دور کا انسان بہت بڑے قد کاٹھ کا رہا ہو اور وقت نے اسے گھس گھس کر ہم جیسا چھوٹا کر دیا ہو!

چین کے باشندے صدیوں ڈائنوسارز کی باقیات تلاش کرتے رہے۔ ان کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ ڈائنوسارز کی باقیات سے ڈریگن (اژدہے) تخلیق کیے گئے۔ چینیوں کے بنیادی مذہبی عقائد میں اژدہا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ چونکہ ڈائنوسارز کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ ان کی ہڈیوں سے اژدہے بنائے گئے اس لئے ڈائنوسارز کی ہڈیوں کا سفوف بہت مہنگا فروخت ہوتا تھا۔ اسے عام طور پر ادویہ کی تیاری میں استعمال کیا جاتا تھا۔

دنیا کے مختلف خطوں میں ڈائنوسارز کے آثار ملتے رہے ہیں۔ ان میں پاکستان کا علاقہ

بلوچستان بھی شامل ہے۔ اور جہاں ڈائنوسارز کے آثار ملے ہیں وہیں دیوقامت انسانوں کے بھی آثار بھی ملے ہیں گو کہ ان کے زمانوں میں خاصا واضح فرق ہے۔ اس کی کوئی باضابطہ توجیہ ابھی تک نہیں ہوسکی ہے۔ امریکہ میں ایلوٹینز کا علاقہ شیمیا اس حوالے سے خاص شہرت رکھتا ہے۔

دنیا کے ہر خطے اور ہر نسل میں ہمیں دیوقامت انسانوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ سینہ بہ سینہ چلی آ رہی روایات میں اس دیوقامت انسان کے بارے میں بہت سی باتیں قدرے مبالغے کے ساتھ بیان کی جاتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی، کسی نہ کسی، شکل میں جاری ہے۔ سائنسی بنیادوں پر کی جانے والی تحقیق سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ان روایات کو اچھی خاصی تقویت ملتی ہے۔

آیئے، دیوقامت انسانوں کی تلاش کا سفر شروع کرتے ہیں۔

دریائے ٹینیسی کے دہانے کے نزدیک برائٹن کے مقام پر ایک چٹان کو دیکھ کر محققین دنگ رہ گئے۔ اس پر ایک دیوقامت انسان کے پیروں کے نشان ثبت تھے۔ اس کی ایڑی کا چوڑائی 13 انچ تھی! اس کی انگلیاں 6 تھیں۔ انہی چٹانوں میں زمانہ ماقبل تاریخ کے گھوڑے کے پیروں کے نشانات بھی ملے جو 8 تا 10 انچ کے تھے۔ یہاں یہ بات بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ معلوم تاریخ سے بہت پہلے کے دور میں انسان اور گھوڑا ساتھ ساتھ رہتے ہوں گے، اس کے شواہد بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اور بظاہر اس کی بھی کوئی توجیہ ماہرین کے بس کی بات نہیں ہے۔

گرانڈ کینین اریا میں سپائی کینن کے نزدیک 1824 کی ڈوہینی مہم کے دوران ایک غار کی دیوار پر ایک ڈائنوسار کی پینٹنگ ملی۔ اس میں ایک بہت بڑے ڈائنوسار کو ایسی حالت میں دکھایا گیا ہے جیسے وہ کسی پر جھپٹنے کی تیار کر رہا ہے۔ پینٹنگ لاکھوں سال پرانی رہی ہوگی اس کے بارے میں تو کسی بھی قسم کے شک وشبہے کی گنجائش ہی نہیں تھی کیونکہ غار کی دیواروں اور اس پینٹنگ پر لوہے کے ذروں کی قدرتی پرت چڑھی ہوئی تھی اور اس سے اس کی قدامت کا اندازہ لگایا جاسکتا کچھ مشکل نہیں تھا۔ سائنس دان اپنی تحقیق سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ علاقہ چار کروڑ سال سے زیر آب نہیں آیا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ جس پینٹنگ کی بات ہو رہی ہے وہ کروڑوں سال پرانی ہے۔ اب یہاں ایک بات اور وضاحت طلب ہے۔ عام طور پر یہ خیال

کیا جاتا ہے کہ ڈائنوسارز کے چلے جانے کی بہت طویل عرصے کے بعد انسان نے کرۂ ارض پر زندگی کا سفر شروع کیا۔ ایسے میں یہ پینٹنگ ایک معمہ بن کر رہ جاتی ہے کیونکہ اسے کسی انسان نے ہی بنایا ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہی بنایا ہوگا کہ اس نے کسی ڈائنوسار کو دیکھا ہوگا۔ اگر اس نے کسی ڈائنوسار کو نہیں دیکھا تو پھر وہ پینٹنگ کس خیال کی بنیاد پر بنائی؟

ہواسپائی کینن کے ایک غار میں ایک دیوقامت انسان کی شبیہ ملتی ہے جو یا تو کسی ڈائنوسار پر حملے کی تیاری کر رہا ہے یا پھر دفاع کے لئے پر تول رہا ہے۔ اس شبیہ کا زمانہ بھی کروڑوں سال پہلے ہے اور یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے۔

1958 میں اٹلی میں کوئلے کی ایک کان میں کھدائی کے دوران ایک چٹان کو توڑا گیا تو اس کی اندرونی پرتوں میں ایک انسانی ڈھانچا ملا۔ یہ پرتیں ایک کروڑ دس لاکھ سال پرانی تھیں۔ اس ڈھانچے کی دریافت نے ماہرین کو چونکا دیا۔ چٹان کی پرتیں واضح طور پر ایک کروڑ دس لاکھ سال پرانی تھیں اور وہاں ایک ڈھانچے کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ اس دور میں انسان تھا اور دیوقامت بھی تھا۔

بیئر کریک، مونٹانا میں ایگل کول مائن میں کھدائی کے دوران دو بہت بڑے انسانی دانت برآمد ہوئے تھے۔ ان دانتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس دور کا انسان بڑے حیوانات کا گوشت بھی کھاتا ہوگا۔ یہ 1926 کی بات ہے۔ یہ وہ دور تھا جب امریکہ میں وایومنگ کے علاقے میں ڈائنوسارز کا راج تھا اور اسی دور میں انسان بھی اپنے ظہور کو مکمل کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

کیلی فورنیا کے ساحلی علاقے لومپوک رینچو میں 1833 میں کھدائی کے دوران ایک انسانی ڈھانچا ملا جو 12 فٹ لمبا تھا۔ یہ ڈھانچا مکمل طور پر پتھروں میں مدفون تھا اور وہ پتھر چٹانوں کی شکل میں کم از کم ایک کروڑ سال پرانے تھے۔ اس سے بھی ہم اس سیارے پر انسان کی قدامت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ ڈھانچا ایک قبائلی علاقے میں ملا تھا اور اس کے ساتھ چند اوزار اور ہتھیاروں کے علاوہ ایسے پتھر بھی تھے جن پر سمجھ میں نہ آنے والی علامات بنائی گئی تھیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس ڈھانچے کو لوگوں نے اپنے کمزور مذہبی عقائد کی بنا پر پوجنا شروع کر دیا۔ یہ حالت دیکھ کر حکام نے فوری طور پر اس ڈھانچے کو اس کے ساتھ ملنے والی تمام اشیا کے ساتھ کسی خفیہ مقام پر دفن کرنے کا حکم دیا اور یوں ماہرین ماضی سے ملانے والی ایک اہم کڑی پر تحقیق کرنے سے محروم رہ گئے۔

کیلی فورنیا کی ہی ساحلی علاقے میں سانتا روزا آئی لینڈ پر ایک ایسے دیوقامت انسان کا ڈھانچا ملا تھا جس کے اوپری اور نچلی دونوں دانتوں کی دو دو قطاریں تھیں۔ دانتوں کی ساخت سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ دیوقامت انسان اس دور کے چھوٹے ہاتھیوں کو کھا کر گزارا کرتا ہوگا۔ اور غالباً اسی لئے اس علاقے میں چھوٹے ہاتھیوں کی نسل ختم ہوئی ہوگی!

1891 کی بات ہے۔ کریٹینڈن، ایریزونا میں ایک تجارتی عمارت کے لئے کھدائی کے دوران پتھر کا بنا ہوا ایک ایسا کیس ملا جو حنوط شدہ لاشوں کو رکھنے کے لئے استعمال ہونے والے تابوتوں سے مشابہ تھا۔ اس میں ایک دیوقامت انسان کے پورے جسم کے نشانات بہت واضح تھے۔ اور اس کا قد 12 فیٹ تھا۔ مگر اس میں انسان کا نام ونشان نہیں تھا کہ لاکھوں سال کے قدرتی عمل میں وہ اب راکھ کا ڈھیر ہو چکا تھا!

"نحوست" ان کی ہم سفر تھی!

حالات کی خرابی سے کسے دوچار نہیں ہونا پڑتا؟ ہر انسان کی زندگی میں مشکلات اور پریشانیوں سے عبارت ادوار آتے ہیں اور تب وہ یا تو اچھے لمحات کو یاد کرکے خدا کی مہربانیوں کا شکرادا کرتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ اگر وہ بحران سے نکل گیا تو اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اگر وہ مثبت سوچ نہ رکھتا ہو تو مشکلات میں خدا سے شکوہ ہی کرے گا کہ دنیا کی ساری بلائیں صرف اس کے حصے میں کیوں لکھ دی گئی ہیں!

خیر، یہ تو کبھی ختم نہ ہونے والی بحث ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ پریشانی میں گھر جائیں تو سہارا مل جاتا ہے اور اس کے بعد پریشانی آئے تو پھر سہارا مل جاتا ہے مگر پریشانی سے دوچار ہونے کا یہ دہرا تجربہ ان کے سارے کس بل نکال دیتا ہے اور ایسے میں اعصاب جواب دینے لگتے ہیں۔ کوئی اگر آپ کو ایسی کہانی سنائے جس میں سمندری سفر کے دوران چار مرتبہ ایک ہی قسم کے حوادث سے دوچار ہونے والوں کا ذکر ہو اور یہ بھی کہ وہ سب کے سب بچ گئے ہوں، تو آپ کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ یقیناً آپ چونک پڑیں گے اور دل کی گہرائیوں سے خدا کے فضل پر ایمان لائیں گے۔

ایسی ہی ایک کہانی لندن کی جہاز راں کمپنی لائڈ (Lloyd) کی فائلوں میں بھی دفن ہے۔ اس کہانی میں مصائب ہیں، الجھنیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بھرپور طور پر زندہ رہنے کی لگن بھی۔ یہ وہ کہانی ہے جس میں قدم قدم پر تھکن بھی ہے اور مکمل تازگی بھی۔

چلئے، لائڈ کی فائلوں کے مطابق سمندری سفر شروع کرتے ہیں۔

یہ 16 اکتوبر، 1829 کی بات ہے۔

اس دن موسم بہت اچھا تھا۔ آسٹریلیا کے شہر سڈنی کی بندرگاہ پر درمیانے حجم کا ایک جہاز

لنگر انداز تھا جو مغربی آسٹریلیا میں کولیئرز بے (Colliers Bay) جانے والا تھا۔ اس جہاز کا نام مرمیڈ (Mermaid) تھا اور جہاز رانی کا اس کا ریکارڈ اطمینان بخش تھا۔

روانگی کے وقت مرمیڈ پر کپتان سیموئل نولبرو اور اس کے 18 ماتحتوں کے علاوہ تین مسافر بھی سوار تھے۔ سمندر میں ہر طرف سکون تھا اور ظاہر ہے کہ سمندری جہاز کے کپتان کے لئے اس سے زیادہ سکون بخش بات کیا ہو سکتی ہے کہ سفر ایسے پانیوں میں کٹے جن میں کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو؟

تین دن خیریت سے گزرے۔ چوتھا دن پریشانیوں کو ساتھ لے کر آیا۔ اس دن بھی موسم بہت اچھا تھا۔ کپتان نے جہاز کا کنٹرول اپنے نائب کو سونپ کر جہاز کے نچلے حصے کی راہ لی جہاں غم غلط کرنے کا سامان پوری تیاری کے ساتھ تھا۔ نولبرو زیادہ نہیں پیتا تھا مگر جب بھی پیتا تھا اچھی چیز پیتا تھا۔ اس نے سڈنی سے روانہ ہوتے وقت بہت اعلیٰ درجے کی شراب کی تین بوتلیں اپنے ذاتی سامان میں رکھ لی تھیں۔ اگرچہ جہاز پر یا نولبرو کے دل میں کوئی غم نہیں تھا جسے وہ غلط کرتا مگر پینے کا شوق تھا اس لئے پینے بیٹھا۔ اور پینے کے بعد آرام کرنے لگا۔ مدہوش ہونے پر وہ آرام کی خاطر ایک طرف پڑ رہتا تھا۔ اس حالت میں وہ اپنے عملے کے سامنے کم کم ہی جاتا تھا کیونکہ اس صورت میں ڈسپلن متاثر ہوتا تھا۔

عملے کے بیشتر افراد عرشے پر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سفر بڑے آرام سے کٹ رہا تھا اور ظاہر ہے کہ ایسے میں ان کے کرنے کے لئے کوئی کام نہیں تھا۔ ایسے میں خوش گپیوں کے سوا بھلا کوئی کیا کر سکتا تھا۔ جہاز کا بیرومیٹر بھی کسی پریشان کن تبدیلی کی اطلاع نہیں دے رہا تھا۔

دن کے دو بجے تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ اس کے بعد اچانک ہوا بند ہو گئی اور سمندر میں ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ جہاز بھی رک گیا۔ ہوا بند تھی اس لئے بادبان بھلا کیونکر جہاز کو کھینچتے؟ یکایک آسمان پر گہرے بادل چھا گئے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب کسی بھی لمحے رحمت ٹپ ٹپ برسنے لگے گی۔ کسی بڑے طوفان سے پہلے کی خاموشی نے سب کو سونگھ لیا۔ جہاز کو کچھ نہیں ہوا تھا اور اس پر سوار تمام افراد بھی خیریت سے تھے مگر پھر بھی دلوں میں اندیشے تھے بلکہ دل اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ایک انجانا سا خوف سب کے اعصاب اور حواس پر سوار تھا اور اسی لئے جہاز پر مکمل خاموشی تھی۔ کوئی بھی کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اسی عالم میں دن ڈھلا اور شام آئی۔

اور پھر تاریکی پھیلتے پھیلتے تیز ہوا چلنے لگی۔ ہوا میں تیزی آئی تو لہروں میں بھی جان آئی اور جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو جہاز سمندر میں پرسکون کھڑا تھا وہ اب لہروں کی فرماں روائی میں داخل ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں بجلی چمکنے لگی اور تیز ہوا سے بادبان پھڑپھڑانے لگے۔ ایسی تیز ہوا میں جہاز کو کنٹرول کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب مرمیڈ اور اس پر سوار 22 افراد سمندر کے موڈ کے رحم وکرم پر تھے۔ رفتہ رفتہ تاریکی گہری ہونے لگی اور اس سے کہیں زیادہ رفتار سے مرمیڈ کے مسافروں کے دلوں میں اندھیرا گھر کرنے لگا۔ سب کی زبان خاموش تھی مگر دل دعاؤں میں مصروف تھے۔ رات کی تاریکی میں بھی سب کی آنکھیں آسمان پر ٹکی تھیں۔ امید کی کرن اب وہیں سے پھوٹ سکتی تھی۔

تیز ہواؤں نے اب طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مرمیڈ کا تو یہ حال تھا جیسے کوئی کاغذ کی ناؤ دریا میں بھٹک رہی ہو! ہر قسم کے کنٹرول سے آزاد جہاز لہروں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے Torres نامی تنگنائے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس محدود سے راستے میں دونوں طرف کٹی پھٹی اور نوکیلی چٹانیں تھیں۔ اس راستے میں بھٹک کر کئی جہاز تباہ ہو چکے تھے۔ اور اب مرمیڈ بھی بدقسمتی کی راہ پر گامزن تھا۔ رات گیارہ بارہ بجے کا شمار ہوگا جب جہاز کے پرخچے اڑنے شروع ہوئے اور تب سب کی جان پر واقعی بن آئی۔ ابھی تک تو سب جہاز کے کیبنوں میں دبکے پڑے تھے۔ مگر اب تو خود جہاز کا وجود خطرے میں تھا۔ ایسے میں انہیں جہاز سے نہ صرف اترنا تھا بلکہ فوری طور پر اترنا تھا۔ ایک چھوٹی سی لائف بوٹ جہاز کے ایک کونے میں موجود تھی۔ جیسے تیسے سب اس پر سوار ہوئے اور مرمیڈ کو الوداع کہی۔ بے یقینی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ رات گہری ہو چکی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا مگر اس کے باوجود وہ دیکھ سکتے تھے کہ سب کے چہروں پر خوف کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔

اب تک تو لہروں کے تھپیڑے صرف مرمیڈ نے کھائے تھے۔ اب اس کے مسافروں کی باری تھی۔ اور یوں لائف بوٹ کا سفر شروع ہوا۔ بچنے کی امید کسی کو نہیں تھی۔ ایک ذرا سی دیر میں مرمیڈ نے سمندر کی گہرائی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ یعنی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ اب تو بس خدا کی ذات تھی جو سمندر کی سفاکی سے انہیں محفوظ رکھ سکتی تھی۔ یہ وقت دعا کا تھا اور سب گڑگڑا کر دعائیں مانگنے میں مصروف تھے۔

جہاں جہاز ڈوبا تھا وہاں سے تقریباً سو گز دور چند چٹانیں تھیں مگر اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ اگر لائف بوٹ کسی بڑی لہر کی زد میں آ کر اچھلی تو چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی اور اس پر سوار افراد کا نہ جانے کیا حشر ہو۔ رات بھر طوفان کا زور رہا۔ صبح صادق کے وقت جب سب کو ہوش آیا تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک بڑی چٹان پر پایا! چند لمحوں کے لئے تو وہ اس بات پر یقین کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ وہ بچ گئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ حیرت اور شکر کی بات یہ تھی کہ سب کے سب بچ گئے تھے!

بچ تو وہ گئے تھے مگر اب بقا کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس راستے سے بہت کم، بھولے بھٹکے جہاز ہی گزرتے تھے۔ اب ایک ایک لمحہ ان کے لئے عذاب تھا۔ کھانے پینے کی اشیا ان کے پاس بہت کم تھیں۔ تھوڑا تھوڑا کھا کر انہوں نے تین دن گزارے۔ تیسرے دن شام کے وقت ایک جہاز اس طرف آ نکلا۔ اس جہاز کا نام **Swifsure** تھا اور وہ ایشیا بحرالکاہل کا سامان لے کر آسٹریلیا سے چلا تھا۔ اسے دیکھ کر سب نے سکون کا سانس لیا اور اس میں سوار ہوئے۔

اگلے پانچ دنوں کا سفر بہت اچھا کٹا۔ تین دن سے انہوں نے بہت کم کھایا پیا تھا۔ سوئفٹ شیور پر انہیں پیٹ بھر کھانے کو ملا۔ نئی زندگی پا کر ان کے چہرے کچھ زیادہ ہی کھل اٹھے تھے۔ انہوں نے سوئفٹ شیور کے مسافروں کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بتائے تو انہوں نے بھی اس بات پر فخر محسوس کیا کہ انہوں نے ایک ڈوبے ہوئے جہاز کے مسافروں کو بچایا ہے۔

اب ایک نیا سفر شروع ہوا جس میں مرمیڈ اور سوئفٹ شیور کے مسافر ساتھ ساتھ شریک تھے۔ چار دن بڑے سکون سے گزرے مگر پانچویں دن حالات نے پلٹا کھایا اور سوئفٹ شیور کے لئے مشکلات کا آغاز ہوا۔ سمندر اچانک بپھر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لہروں نے آسمان کو چھونا شروع کر دیا۔ سب کی جان پر بن آئی۔ ایک لمحے کو تو ایسا لگا کہ نصیب خراب ہے اور اب موت یقینی ہے۔ مگر پھر انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ نصیب اچھا ہے کیونکہ جس جگہ جہاز لہروں میں ہچکولے کھا رہا تھا وہ ساحل سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔ تین لائف بوٹس میں سوار ہو کر سوئفٹ شیور کے تمام مسافر نیوگنی کے ساحل پر اتر گئے۔ جہاز ان کی آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا۔ جہاز کے ڈوبنے کا سب کو افسوس تھا مگر جان بچ گئی، اس کی خوشی بھی تھی۔

اب یہ لوگ **Governor Ready** پر سوار ہوئے۔ یہ جہاز کھانے پینے کا سامان لینے

نیو گنی کے ساحلوں کی طرف آیا تھا۔ مرمیڈ کے مسافروں کا یہ تیسرا اور سونفٹ شیور کے مسافروں کا دوسرا سفر تھا۔ مرمیڈ کے مسافروں کو تیسری اور سونفٹ شیور کے مسافروں کو دوسری زندگی ملی تھی۔ ابھی تک کوئی بھی مسافر ہلاک نہیں ہوا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی ایسا زخمی بھی نہیں ہوا تھا کہ جسے کہا جائے کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔ یہ اس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ گورنر ریڈی پر بھی اس کا ذکر ہوتا رہا۔ پہلے اپنی داستان صرف مرمیڈ کے مسافروں نے سنائی تھی۔ اس کام میں اب سونفٹ شیور کے مسافر بھی شریک ہو گئے تھے۔ گورنر ریڈی پر سوار تمام مسافر بھی ان کی [illegible] رہ گئے [illegible] انہوں نے زندہ رہ جانے والے تمام افراد کو مبارکباد پیش کی اور اس خوشی میں ان کے اعزاز میں خصوصی طعام کا اہتمام کیا۔ جہاز چھوٹا سا تھا مگر اس میں سوار لوگوں کے [illegible] تھے۔ انہوں نے اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر [illegible] کا [illegible] تھا۔

[illegible]

آزمائش میں [illegible] پہلے دونوں جہازوں [illegible] مسافر [illegible] پریشانیوں [illegible] تھے کہ اب ان میں مزید سختیاں جھیلنے کی سکت باقی نہیں تھی۔ سمندر میں پانی کی کیا کمی تھی مگر پھر بھی وہ ان کے لیئے چھوڑ [illegible] رہتا ہوا تھا!

ابھی سفر کو شروع ہوئے صرف آٹھ گھنٹے گزرے تھے کہ سمندر نے بپھرنا شروع کر دیا اور ذرا سی دیر میں طوفان کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اور آثار کیا، خود طوفان قیامت کی چال چل کر ان کے پاس آ گیا! یہ عجیب مذاق تھا۔ جس طرف یہ لوگ جاتے تھے کوئی نہ کوئی طوفان ان کی راہ دیکھتا دکھائی دیتا تھا! اب پھر افتاد آن پڑی تھی۔ اور اس افتاد نے ان سب کے ہوش اڑانے میں دیر نہیں لگائی۔ اور پھر قیامت پر قیامت یہ برپا ہوئی جہاز میں آگ بھی لگ گئی۔ دوسرے سامان کے ساتھ ساتھ اس پر عمارتی لکڑی بھی لدی ہوئی تھی اس لئے آگ نے وقت ضائع کیئے بغیر بہت تیزی سے اپنا دائرہ وسیع کر لیا۔

اب کے مسافروں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ 32 افراد تو گورنر ریڈی کے تھے اور دوسرے دونوں جہازوں کے مسافر بھی ان کے ساتھ تھے۔ کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ان کے پاس چار لائف بوٹس تھیں اور ہنگامی صورت سے نمٹنے [illegible] ان کارخ کیا تھا۔ سب نے جہاز کو [illegible] لائف بوٹس میں پناہ لی اور [illegible] پانی کا [illegible]

گورنر ریڈی کو بھی وہی حشر ہوا جو مرمیڈ اور سونفٹ شیور کا ہوا تھا۔ اس جہاز نے بھی ڈوبنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگائی۔

تین جہازوں کے خوش نصیب اور بدنصیب مسافر ایک بار پھر سمندر کے رحم و کرم پر تھے۔ خوش نصیب اس لئے کہ تین جہاز [illegible] پر وہ سوار ہوتے تھے وہ ڈوب جاتے تھے اور بدنصیب اس لئے کہ ابھی تک ان میں سے کوئی بھی ہلاک نہیں ہوا تھا اور یہ اس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ بچ جانے والوں کے پاس بے اختیار ہو کر خدا کا شکر ادا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ [illegible] تقدیر [illegible] ہمت [illegible] گئے۔ ابھی [illegible] پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ انہیں امید تھی کہ اس مرتبہ بھی کوئی نہ کوئی انہیں بچانے ضرور آئے گا۔ اور آئے گا کیا، خدا خود انہیں بھیجے گا۔ اور خدا نے انہیں مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا! [illegible] ایک جہاز Comet اس طرف آ نکلا! یہ جہاز عام طور پر [illegible] معین بحری راستوں سے سفر کرتا تھا مگر شارٹ کٹ کی خاطر اس کے کپتان نے دوسرا راستہ اپنایا [illegible] گورنر ریڈی [illegible] مسافر زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے میں مصروف تھے۔ خدا کی رحمت کو ایک بار پھر اپنی طرف آتا دیکھ کر ان کے بجھے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ زندگی ایک بار پھر خود ان کی طرف آ رہی تھی۔ ایک بار پھر انہوں نے دل کی گہرائیوں سے خدا کا شکر ادا کیا۔

کومیٹ کے عملے نے انہیں خوش آمدید کہا اور یوں سب نے مل کر ایک اور سفر شروع کیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس مرتبہ بھی کوئی ہلاک نہیں ہوا تھا! اب ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا جنہیں قدرت نے نئی زندگی دی تھی۔ کومیٹ پر سوار لوگوں کی زبان پر بیتی ہوئی پریشانیوں کی داستانیں تھیں۔ ان داستانوں کو سن کر کومیٹ کا عملہ پہلے تو بہت محظوظ ہوا اور پھر انہیں غیر محسوس طور پر اس خیال نے گھیر لیا کہ یہ لوگ اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ اب تک ان میں سے کوئی ہلاک نہیں ہوا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بدنصیب بھی تو تھے کہ جس جہاز پر یہ لوگ قدم رکھتے تھے وہ ڈوب جاتا تھا! بچ جانے والے چند مسافر بھی اب دبی زبان میں نحوست کی بات کرنے لگے تھے۔ اس بات کو کھل کر اس لئے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ابھی نئی زندگی [illegible] میں مصروف تھے۔

[illegible]

ابھی کومیٹ نے تینوں جہازوں کے مسافروں کے ساتھ نیا سفر شروع ہی کیا تھا کہ اسے بھی حادثہ پیش آ گیا! صرف تین گھنٹے گزرے تھے کہ اس میں آگ لگ گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا جہاز اس آگ کی لپیٹ میں آتا دکھائی دیا۔ ایک بار پھر ہڑبونگ مچ گئی۔ جہاز پر تین لائف بوٹس تھیں مگر ان میں سے صرف ایک اس حالت میں تھی کہ اس پر سوار ہو کر بچ نکلنے کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ اور اس پر جہاز کے عملے نے قبضہ کر لیا۔ اس پر 40 افراد کے سوار ہونے کی گنجائش تھی مگر عملے نے کوئی رسک لینا مناسب نہیں جانا اور تینوں جہازوں کے ''بدنصیب'' مسافروں کو اس حالت میں الوداع کہی کہ وہ گڑگڑا کر ان سے رحم کی درخواست کر رہے تھے۔ جس وقت کومیٹ کے عملے نے لائف بوٹ پر اپنا سفر شروع کیا اس وقت تک کومیٹ کے عرشے پر آگ لگی ہوئی تھی۔

اب پھر سمندر تھا، خطرناک شارکس تھیں اور حالات کے ستائے ہوئے مسافر تھے جو تین جہازوں سے ہوتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ اب تک ایک بھی فرد ہلاک نہیں ہوا تھا۔ کومیٹ میں آگ تو لگ چکی تھی مگر ابھی وہ ڈوبا نہیں تھا۔ اس پر جو دو ناکارہ لائف بوٹس تھیں انہیں تھوڑی محنت سے سفر کے قابل بنایا گیا اور جہاز سے کھانے پینے کی بچی کھچی اشیا اور پانی لے کر یہ لوگ لائف بوٹ پر سوار ہوئے اور جہاز کو پرنم آنکھوں سے خیر باد کہا۔

اس مرتبہ موت سے دفاع کی جنگ بہت مشکل ثابت ہو رہی تھی۔ لائف بوٹ پر گنجائش سے زیادہ افراد سوار تھے۔ کھانے پینے کی اشیا بھی زیادہ نہیں تھیں۔ ایک ایک لمحہ بہت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اور صرف کشتی پر ہی حالات خراب نہیں تھے بلکہ سمندر میں بھی بلائیں ان کی منتظر تھیں۔ سمندر کا یہ حصہ شارکس سے اٹا پڑا تھا اور وہ انسانی گوشت کو خوراک کا حصہ بنانے کے لئے بے تاب تھیں۔ مگر اس مرتبہ بھی تقدیر حالات کے ستائے ہوئے مسافروں کے ساتھ تھی۔ انہوں نے ہر بار بچ جانے پر خدا کو یاد رکھا تھا۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ خدا انہیں بھول جاتا؟

سمندر کی بے رحم موجوں اور ان سے بھی زیادہ بے رحم شارکس سے لڑتے ہوئے انہیں 18 گھنٹے گزر گئے اور ان 18 گھنٹوں کے دوران انہیں اگرچہ سخت ذہنی اور اعصابی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا اور سب پر عجیب وحشت سی طاری رہی مگر کسی بھی لمحے انہوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کا پرامید رہنا رنگ لایا اور ان کی مدد کے لئے خدا نے **Jupiter** نامی

جہاز کو بھیجا۔ یہ ایک بڑا جہاز تھا جس کے عملے نے انہیں بخوشی قبول کیا۔ اور جب مہمانوں نے میزبانوں کو اپنی کہانی سنائی تو وہ حیرت سے انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔ اب بھی تمام مسافر سلامت تھے۔ اور اسے وہ ایک معجزہ قرار دے رہے تھے۔

مگر ایک معجزہ اس کے علاوہ بھی تھا۔

جیوپیٹر پر امریکہ کی مسز سارہ رچ بھی تھیں جو اپنے بیٹے پیٹر کو تلاش کرنے آسٹریلیا جا رہی تھیں۔ وہ 15 سال قبل آسٹریلیا گیا تھا اور تب سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اور مسز سارہ کی قسمت کہ ان کا پیٹر مرمیڈ کے بچے مسافروں میں شامل تھا!

کیا تمام مسافروں کی زندگی بار بار اس لئے بچ رہی تھی کہ ایک دکھیاری ماں کو ایک بار پھر اپنے لخت جگر کا منہ دیکھنا تھا؟

محسوس تو کچھ یہی ہوتا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

کشش کی کہانی

آپ اس زمین کو چھوڑ کر کہیں جا سکتے ہیں؟ کہیں نہیں۔ اس لئے کہ ہر چیز کو ہماری یہ زمین اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس قوت کے ساتھ کھینچتی ہے کہ اس کی کشش سے اپنے آپ کو مستثنیٰ رکھنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ یہ سوچیں کہ ہم طیارے میں بیٹھ کر اپنے مرضی سے جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ مگر یہ محض خوش فہمی ہے۔ زمین سے بلند ہو کر بھی ہم زمین کی حدود میں ہی رہتے ہیں۔ طیارہ چاہے کہیں چلا جائے وہ رہے گا زمین کی دسترس میں۔

ایسے میں آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ آپ خلائی جہاز میں بیٹھ کر زمین کی کشش کے دائرے سے نکل سکتے ہیں مگر جائیں گے کہاں؟ کہنے کو آپ زمین کے حد سے اور اس کے ماحول کی دسترس سے دور ہوں گے مگر سچ یہ ہے کہ آپ زمین کے مدار میں چکر کاٹتے رہیں گے۔ اور مدار سے نکل بھی گئے تو ایک وسیع تر مدار میں چلے جائیں گے۔

اس کے بعد ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ بات ابھرے کہ اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ چاند پر بستی بسالیں۔ ٹھیک ہے، آپ کی بات درست ہے لیکن اگر چاند پر بھی بس گئے تو کیا ہے؟ چاند تو خود زمین کا طفیلیا ہے! کیا چاند کے لئے یہ ممکن ہے کہ زمین کی حد سے نکل جائے؟ کسی طور ایسا ممکن نہیں۔

اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ زمین کی کشش کیا چیز ہے۔ اگر یہ کشش نہ ہو تو ہم آپ کائنات کی وسعتوں میں گم ہو کر رہ جائیں۔ زمین گول ہے۔ یہ بیک وقت سیدھی بھی ہے اور الٹی بھی۔ مگر ہم جہاں بھی کھڑے ہوں، اپنے آپ کو سیدھا محسوس کرتے ہیں اور دنیا کا کوئی بھی انسان کبھی یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ زمین سے الٹا لٹکا ہوا ہے۔ یہ اللہ کا کرم نہیں تو اور کیا ہے؟

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ زمین پر سب سے حیران کن مقام کہاں ہے؟ زمین کی کشش

سب کو، ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور کھینچ کر رکھتی ہے۔ اور اگر کہیں بہت زیادہ کشش ہو تو؟ ظاہر ہے کہ وہ مقام خاص طور پر آپ کی توجہ کا مرکز بنے گا۔ ایسا ہی ایک مقام امریکی ریاست اوریگن میں ہے۔ یہ مقام سارڈن کریک کے نزدیک واقع ہے اور گرینڈ پاس سے اس کا فاصلہ تیس میل ہے۔ وہاں 165 میٹر کے قطر کا ایک قطعۂ اراضی ایسا ہے جو غیر معمولی کشش کا حامل ہے۔ اسے اوریگن ورٹیکس کہا جاتا ہے۔ اس دائرے کے اندر جو بھی چیز داخل ہوتی ہے اسے اس کا مرکز اس تیزی اور قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتا ہے کہ اس حالت کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

کسی زمانے میں یہاں ایک سرکاری دفتر ہوا کرتا تھا مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ کسی کو یاد نہیں یہاں سے سرکاری دفتر کب منتقل کر دیا گیا۔ جب اس مقام پر اچانک انتہائی غیر معمولی کشش نے اپنا جلوہ دکھانا شروع کیا تب لوگ ایک انجانے خوف میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے اس طرف آنا چھوڑ دیا۔ اس چھوٹے سے قطعۂ ارضی کے بارے میں طرح طرح کی داستانیں زبان پر آنے لگیں۔ بہت سے لوگ ذرا سی بات کو بھی بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا ان لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور اس مقام کے بارے میں طرح طرح کے قصے گھڑ کر سنانے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ مقام پراسرار اور خطرناک ہوتا چلا گیا اور یوں لوگوں میں خوف بھی بڑھتا گیا۔ بہت سے توہم پرستوں نے تو اس مقام کے قرب و جوار سے گزرنا بھی چھوڑ دیا۔ اب کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ یہاں قیام اور کام کرے۔

اوریگن ورٹیکس میں ہر چیز اپنے مرکز سے ہٹ کر اس کے مرکز کی طرف کھنچنے لگتی ہے جو ایک شیڈ کے نیچے واقع ہے۔ سائنس دانوں نے بہت کوشش کی مگر وہ اب تک اس مقام پر اس قدر غیر معمولی کشش کا راز معلوم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کشش کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی زنجیر سے لوہے یا فولاد کی کوئی وزنی گیند باندھ کر لٹکائی جائے تو وہ اپنی سمت چھوڑ کر اس دائرے کے مرکز کی طرف اڑنے لگتی ہے! اسی طرح اگر لوہے کی یا کسی بھی دوسری دھات کی کوئی چیز اس دائرے کے پاس رکھ دی جائے تو وہ خود بخود اس کے مرکز کی طرف کھسکنے لگتی ہے! جو لوگ اس دائرے کے پاس کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی اس کی کشش کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتے۔ یہاں کشش گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ جب بھی کشش بہت بڑھ جاتی ہے تب یہاں کھڑے ہونے والے ایک طرف کو جھک سے جاتے ہیں!

اگر اس دائرے کے پاس کھڑے ہو کر سگریٹ پیجئے تو دھواں بڑی تیزی سے گردش کرتا ہوا اس دائرے کے مرکز کی طرف سفر کرنے لگتا ہے اور وہاں پہنچ کر اس کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس کی گردش ہزاروں گنا بڑھ جاتی ہے۔ اس دائرے کے پاس قطب نما کام کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اگر آپ کاغذ کا کوئی ٹکڑا اس دائرے کی طرف اچھال دیں تو یہ اس طرح مرکز کی طرف بڑھتا ہے جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔

اوریگن کورٹیکس کی کشش بہت حد تک برقی مقناطیسی لہروں کے باعث ہے۔ اور موسمیاتی تغیر کے ساتھ ساتھ کشش کی شدت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

اوریگن کورٹیکس سے پینتالیس میل دور سسکیو ماؤنٹین کے مقام پر بھی ایک ایسا قطعۂ اراضی ہے جس کی حدود میں کشش بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور جو چیز اس کی طرف اچھالی جائے وہ اس کے مرکز کی طرف کھنچنے لگتی ہے۔ مگر انہیں زیادہ خطرناک اس لئے خیال نہیں کیا جاتا کہ یہاں اضافی کشش بہت زیادہ نہیں۔ ایسا ہی ایک مقام کیمپ برچ، کولوراڈو میں بھی ہے، تاہم اس مقام پر بھی اضافی کشش بہت زیادہ نہیں۔ یہاں بھی لوگ قدرتی کی اس کاری گری کا تماشا دیکھنے آتے ہیں اور حیران ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

جب امریکہ نے روحانی ماہر کا سہارا لیا!

کرنل چارلس لنڈ برگ کو کون نہیں جانتا؟ شمالی بحر اوقیانوس پر پہلی سولو، نان اسٹاپ پرواز کے حوالے سے دنیا انہیں ایک ایسے انسان کے روپ میں جانتی ہے جس نے عزم و ہمت کے نئے معیارات قائم کئے اور ثابت کیا کہ انسان اگر چاہے تو کوئی بھی کارنامہ بڑی آسانی سے انجام دے سکتا ہے۔ مگر ایسے اولوالعزم انسان کو ایک مرتبہ ایک ایسے تجربے سے گزرنا پڑا جس نے سے اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ کسی نے اس کے بچے کو اغوا کر کے قتل کر دیا! اغوا کا یہ ڈرامہ تاوان کے لئے تھا اور تاوان ادا بھی کیا گیا۔

یکم مارچ، 1932 کی شام لنڈ برگ کی زندگی میں اندھیرے لے کر آئی۔ ہوپ ویل، نیو جرسی (امریکہ) کے مضافاتی علاقے میں لنڈ برگ کا ایک خوبصورت مکان تھا۔ اس شام اس مکان کے جس کمرے میں چارلس لنڈ برگ کا بیس ماہ کا بیٹا سویا ہوا تھا اس کی کھڑکی کے نیچے ایک کار آ کر رکی۔ کار سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر آیا اور اس نے ایک فولڈنگ سیڑھی کی مدد سے کھڑکی تک پہنچ کر اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں لڑکا اکیلا سو رہا تھا۔ اس شخص نے بچے کو اٹھایا اور نیچے اتر گیا۔ اور اس کے بعد اس کا کوئی پتا نہ چلا!

بچہ کیا اغوا ہوا، ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یہ چارلس لنڈ برگ کا بچہ تھا، شور تو مچنا ہی تھا۔ پولیس الرٹ ہو گئی اور بچے کی تلاش شروع کر دی گئی۔ جہاں کہیں بھی ذرا بھی سراغ مل سکتا تھا وہاں تفتیش کی انتہا کر دی گئی مگر بچے کا کچھ سراغ نہ ملا۔

اس اغوا نے عالمی اخبارات میں جگہ پائی۔ امریکی پولیس کے لئے یہ بہت بڑا معمہ تھا۔ اس واردات سے چند ایسی باتیں بھی وابستہ ہو گئیں جن کی بظاہر کوئی توجیہ ممکن نہیں تھی۔ چند ایک لوگوں نے اس حوالے سے شہرت بٹورنے کی کوشش بھی کی۔ نا [illegible] ،ور بینبا کے ایک

تاجر نے دعوٰی کیا کہ اغوا کنندہ نے اس سے رابطہ قائم کیا ہے۔ پولیس نے اس کی بات مان کر کئی قیمتی دن ضائع کیے۔ آخر اس تاجر نے خود ہی کہہ دیا کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں جانتا اور یہ کہ وہ تو محض شہرت کا طالب تھا۔

ایک دن پولیس کو ایک نوٹ ملا کہ بچہ ایک بوٹ میں ہے۔ جب پولیس نے اس نوٹ کی مدد سے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ کسی نے مذاق کیا ہے۔ ایک سنکی، ریٹائرڈ اسکول ٹیچر نے پولیس کی جانب سے ایک مقامی اخبار میں اشتہار دے دیا! اور کسی طرح یہ اشتہار ان لوگوں نے بھی پڑھ لیا جنھوں نے بچے کو اغوا کیا تھا۔ اور پھر انہوں نے پولیس سے رابطہ کیا اور تاوان بھی وصول کرلیا۔ اور ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ایک اچھی خاصی رقم وصول کرنے کے بعد بھی انہوں نے بچے کو آزاد نہیں کیا۔ اب تو پولیس واقعی مشتعل ہوگئی۔ اس کے اعلیٰ حکام ہر حالت میں یہ چاہتے تھے کہ مجرم پکڑے جائیں۔ اس معاملے کو کئی ماہ بیت چکے تھے اور اب پولیس پر ہر طرف سے تنقید ہو رہی تھی۔

اسی دوران ایک جرمن باشندے برونو ہاپٹ مین کے لائف اسٹائل میں غیر معمولی تبدیلی دیکھی گئی۔ وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا۔ کوئی کام دھندا بھی نہیں کرتا تھا مگر اس کے باوجود وہ بہت پرتعیش زندگی گزار رہا تھا۔ پولیس نے اس پر نظر رکھی اور ایک دن گھیر ہی لیا۔ وہ اس بات کا کوئی کوئی اپنے ذرائع آمدنی کے بارے میں کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اور پھر جب اس پر سختی کی گئی تب اس نے بتایا کہ چارلس لنڈ برگ کے بچے کے اغوا میں وہ بھی شریک تھا مگر اپنے ساتھیوں کے بارے میں وہ کچھ بھی نہ بتا سکا۔ وہ لوگ بچے کو لے کر کسی نامعلوم مقام پر چھپے ہوئے تھے۔ بہرکیف پولیس نے ہاپٹ مین کو تو تحویل میں لے ہی لیا۔ بعد میں واقعاتی شواہد کی بنیاد پر اسے سزائے موت دی گئی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ پولیس نے اس مرد اور عورت کو تلاش کرنے میں زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی جو بچے کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ اور دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بچے کی نرس بیٹیگاؤ نے بچے کے اغوا پر دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی!

بروکلین کے ایک منسٹر (پادری) نے پولیس کو بتایا کہ ایک عورت بچے کے بارے میں اپنی روحانی طاقت کی مدد سے بہت سی کام کی باتیں بتا سکتی ہے اور تنگ آئی ہوئی پولیس نے یہ حربہ بھی آزمانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس عورت کا یہ کہنا تھا کہ اگر وہ بچے کے کمرے میں بیٹھ کر مراقبہ کرے تو کام کی باتیں آسانی سے بتا سکے گی۔ مگر مسز لنڈ برگ کی حالت اچھی نہیں تھی

اس لئے اسے ایک سامنے کے مکان میں لے جایا گیا جہاں سے اس کمرے کی کھڑکی صاف دکھائی دیتی تھی جس سے بچے کو اغوا کیا گیا تھا۔ تین چار گھنٹوں میں اس عورت نے دو پولیس افسران اور ایک اسٹینوگرافر کو بہت سے کام کی باتیں بتائیں۔ اور یہ بھی بتایا کہ بچے کو اغوا کرنے والے اس جگہ سے چار کلومیٹر دور ایک ایسے مکان میں چھپے ہوئے ہیں جو پر رنگ نہیں کیا گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان لوگوں کے پاس ایک طاقتور دوربین بھی ہے جس کی مدد سے وہ لنڈ برگ کے مکان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پولیس نے اس کی باتیں سن لیں مگر ان پر یقین یا عمل کرنے سے گریز کیا۔ اس کے ٹھیک تین ہفتوں بعد بچے کی لاش مل گئی! لاش لنڈ برگ کے مکان سے تقریباً سوا چار کلومیٹر ایک ایسے مکان سے ملی جو ادھورا پڑا تھا اور ابھی اس پر پینٹ بھی نہیں کیا گیا تھا۔

ذہن کی حد کس نے جانی؟

کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ بے انتہا ترقی کے بعد بھی سائنس دانوں کو ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کہ آخر ذہن میں کس قدر صلاحیتیں اور سکت پائی جاتی ہے؟ ہر دور میں انسان کا سفر آگے کی طرف رہا ہے۔ جو کچھ چار سو سال پہلے نہیں تھا وہ تین سو سال پہلے انسان کی دسترس میں آ گیا۔ اور اسی طرح جو کچھ آج نہیں ہے اور محض خیالوں میں ہے وہ بہت جلد دیکھنے کو مل جائے گا۔ انسان نے اپنے ذہن کے بہت سے انتہائی کارآمد گوشوں اور پہلوؤں کو شاید آج تک دریافت نہیں کیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آج تک جس قدر بھی پیش رفت اور ترقی ہوئی ہے وہ انسانی ذہن کی آٹھ تا دس فیصد صلاحیتوں کا ثمر ہے! سائنس دان ذہن کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں مصروف ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ہم فی الحال انہونی سمجھی جانے والی کئی چیزوں سے استفادہ کر سکیں گے۔

بہت سے لوگوں کا ذہن ایک اسٹور کی مانند ہوتا ہے جس میں دنیا بھر کی یادیں اور باتیں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی قوت حافظہ بہت مستحکم ہوتی ہے اور وہ جو کچھ بھی یاد کرنا چاہتے ہیں بڑی آسانی سے یاد کر لیتے ہیں۔ یہ صلاحیت بھی کچھ کم اہم نہیں مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کوئی اپنے ذہن کو استعمال کر کے کیا کیا کر سکتا ہے۔ آپ نے ایسے لوگ دیکھے ہوں گے جو حساب کتاب میں بڑے ماہر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی بھی سوال رکھ دیجئے، وہ ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر اس سوال کو اس طرح حل کر دیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسے لوگ چلتے پھرتے کیلکولیٹر کی مانند ہوتے ہیں اور حساب کتاب کی کوئی بھی بات ان کی دسترس سے دور نہیں ہوتی۔

ماہرین کہتے ہیں کہ ہمارا شعور اور لاشعور ہمارے پورے وجود پر محیط ہوتا ہے اور ہم جو کچھ

بھی کرتے ہیں وہ اس میں **programmed** ہوتا ہے۔ اور اسی لئے شعور اور لاشعور کے تجزیئے کی مدد سے ہم کسی کی شخصیت کا بہتر طور پر اندازہ لگانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ تحت الشعور میں ایک بار داخل ہونے والی بات شاذ و نادر ہی کبھی باہر آتی ہے۔ یوں ہم زندگی بھر یادوں اور باتوں میں گھرے رہتے ہیں۔ جلوت ہو یا خلوت، خیالات ہماری جان نہیں چھوڑتے اور ہمیں رفتہ رفتہ خیالات کے ساتھ زندگی گزارنے کا عادی ہونا پڑتا ہے۔

جو لوگ ذہن کو بروئے کار لا سکتے ہیں ان کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور وہ دوسروں سے بہت نمایاں ہو کر زندگی بسر کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ آپ نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہوں گے جو اپنی ذہنی استعداد کو بروئے کار لا کر دوسروں کا ذہن بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اسی طرح ذہن کو محو خواب کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ یہ ہمارا ذہن ہی ہے جو خوابوں کے ذریعے ہمیں زمان و مکان کی تمام حدود سے بہت دور لے جاتا ہے۔ خواب کی دنیا دراصل ذہن کے خزانے سے ہی تشکیل پاتی ہے۔ جو کچھ ہم دیکھتے اور سنتے ہیں اور اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے ہیں اسی کی بنیاد پر خواب وجود میں آتے ہیں اور ان خوابوں میں ہماری نا آسودہ خواہشات تسکین پاتی ہیں۔

اگر آپ چاہیں تو مشق کے ذریعے اپنے اندر اس قدر مہارت پیدا کر سکتے ہیں کہ کسی بھی کتاب پر ایک نظر ڈالنے سے اس کے مندرجات آپ کو ازبر ہو جائیں۔ ریکارڈز سے پتا چلتا ہے کہ ایسے لوگ تاریخ کے ہر دور میں رہے ہیں جو لاکھوں باتوں کو یاد رکھنے کی سکت رکھتے تھے۔ اور ان کی اس صلاحیت کے عملی مظاہر بھی لوگوں نے دیکھے۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو قدرتی طور پر یہ صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے کہ کسی بھی کتاب کو ایک نظر دیکھ لینے کی صورت میں اس کا ایک ایک صفحہ ان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتا تھا۔

آیئے، آپ کو ایسے ہی چند لوگوں کے بارے میں بتائیں جن کی ذہنی قوت بے پناہ تھی اور جو اپنے دور سے بہت ہٹ کر اور بہت آگے تھے۔

لتھوانیا کا ایک ربی (یہودی عالم) ایلیجاہ (ایلیا) انتہائی غیر معمولی حافظہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ وہ جس کتاب کو ایک بار پڑھ لیتا تھا وہ پھر اس کے ذہن سے باہر نہیں آتی تھی۔ کیا خیال ہے؟ ایلیجاہ نے کتنی کتابیں اپنے ذہن میں محفوظ رکھی ہوں گی؟ ایک دو نہیں، پوری دو ہزار

کتابیں اس کے حافظے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ تھیں! ان کتابوں کا ایک ایک لفظ اسے ازبر تھا۔ جہاں سے بھی چاہتے، لوگ اس سے کوئی بھی پیراگراف سن سکتے تھے۔ آپ سوچیں گے کہ یہ تو بہت بڑی نعمت ہوئی۔ مگر نہیں! ایلیجاہ کے لئے یہ غیر معمولی حافظہ نعمت نہیں بلکہ زحمت تھا۔ وہ اسے اپنے لئے عذاب کی ایک صورت سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''میرا ذہن کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اس میں دنیا بھر کی باتیں گردش کرتی رہتی ہیں اور میں اپنے آپ کو بھی بڑی مشکل سے میسر ہو پاتا ہوں۔ میرے ذہن میں دو ہزار سے زیادہ کتابیں محفوظ ہیں مگر یہ ایسی حالت ہے کہ جیسے کوئی ہر وقت اپنے ساتھ ایک پوری لائبریری لئے پھرتا ہو!''

ایلیجاہ کی بات غلط نہیں تھی۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کا ذہن ہر وقت active رہتا تھا اور اسی لئے اسے کچھ سوچنے اور سمجھنے میں بھی بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو اس کی بات عجیب محسوس ہو مگر بھئی، قبر کا حال تو مردہ ہی جانتا ہے!

فرانس کے ایک سائنسدان لیئوں کیمبٹا کا بھی یہی حال تھا۔ وہ مواد کو یاد رکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا اور وکٹر ہیوگو کی تحریروں پر مبنی ہزاروں صفحات اسے مکمل طور پر ازبر تھے اور وہ ایک ایک لفظ کو پوری صحت کے ساتھ بیان کر سکتا تھا۔

یونان کا رچرڈ پورسن بھی مواد کو پوری صحت کے ساتھ یاد رکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسے بھی درجنوں کتابیں یاد تھیں۔

امریکہ کے ہیری نیلسن پلز بری کی ذہنی قوت اس قدر تھی کہ وہ بیک وقت شطرنج کی 22 بازیاں یاد رکھ سکتا تھا اور یوں اتنے ہی افراد سے بیک وقت مقابلہ کرتا تھا۔ ایک نظر ڈال کر وہ پوری بازی کو تمام چالوں کے ساتھ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کرتا تھا۔ وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی شطرنج کھیلنے کا ماہر تھا۔

میتھورین ویزیئر پرشیا کے بادشاہ کا لائبریرین تھا۔ وہ اس قدر قوی حافظہ کا مالک تھا کہ اگر کسی بھی شخص سے کسی بھی زبان میں کوئی بات سنتا تھا تو بعد میں اس بات کو من و عن بیان کر سکتا تھا۔ ایک بار اس کی اس صلاحیت کی آزمائش بھی کی گئی۔ 12 افراد کے سامنے اسے پیش کیا گیا اور ہر ایک نے باری باری مختلف زبان میں چند جملے ادا کئے اور بعد میں ویزیئر نے ہر ایک کا جملہ اسی زبان میں پوری صحت اور درست لہجے کے ساتھ ادا کیا۔

دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ ریاضی کے بڑے بڑے سوال پلک جھپکتے میں حل کر دیتے

ہیں اور اس سے ان کے ذہن پر کوئی قابل ذکر بوجھ بھی نہیں پڑتا۔ امریکہ کا زیرا کولبرن بھی ایک ایسا ہی انتہائی حیرت انگیز ذہن رکھتا تھا۔ وہ جب آٹھ سال کا ہوا تب حساب کا کوئی بھی سوال بڑی آسانی سے حل کرنے کے قابل ہو گیا۔ اس کی اس صلاحیت نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ایک بار اس نے لندن میں ماہرین کے سامنے 21,735 کو 543 سے ضرب دیا اور محض چار سیکنڈز میں جواب بتا دیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے یہ کام کس طرح کیا تو وہ بڑی ہی سادگی اور بھولپن سے بولا، ''میں نے 62,205 کو 181 سے ضرب دے دیا اور جواب مل گیا۔'' اس جواب نے سوال کرنے والوں کو مزید الجھن میں مبتلا کر دیا!

1824 میں ہیمبرگ، جرمنی میں پیدا ہونے والا جوہان مارٹن ڈیز بھی انتہائی غیر معمولی ذہنی قوت کا مالک تھا۔ اس نے ایک بار پورے ایک سو ڈیجٹس والے ایک عدد کا نوے ڈیجٹس والے ایک عدد سے حاصل ضرب چند سیکنڈز میں دریافت کر لیا تھا اور اس کارنامے پر اس دور کے بڑے سائنس دان اور ریاضی دان صرف عش عش کرتے رہ گئے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے بس رسمی سی تعلیم پائی تھی۔

ٹام فلر کا کیس اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ وہ ایک غلام تھا اور تعلیم کیا ہوتی ہے اس کا اسے کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔ اسے تو ایک غلام کی حیثیت سے کام کرنا ہوتا تھا اور وہ رات دن کام میں لگا رہتا تھا کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اسے کوڑے کھانے پڑتے تھے! وہ ایک عظیم ذہن کا مالک تھا۔ مگر یہ بات خود اسے بھی تب معلوم ہوئی جب وہ 70 سال کا ہوا۔

یہ اگست، 1779 کا قصہ ہے۔ ایک دن وہ اپنے مالک کے کھیتوں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایک منشی فصل کی مالیت کا حساب لگا رہا تھا مگر اس کے اور مالک کے حساب کتاب میں اچھی خاصی گڑبڑ تھی۔ اور دونوں میں اتفاق رائے نہیں ہو پا رہا تھا۔ جب اس قضیے میں بہت دیر ہو گئی اور ٹام فلر سمیت تمام غلاموں نے سوچا کہ وقت ضائع ہو رہا ہے تو فلر آگے بڑھا اور اس نے اپنے مالک سے کہا، ''اگر آپ کہیں تو میں حساب کتاب نمٹا دوں؟'' وہ یہ بات سن کر حیران رہ گیا کہ اس کا بوڑھا، ناخواندہ غلام حساب کتاب جانتا ہے! حیرت کے ساتھ اس نے فلر کو اجازت دے دی۔ فلر نے صرف بیس سیکنڈز میں حساب کر دیا اور اس کا جواب بالکل درست تھا۔ اس جواب کو ایک اسکول ٹیچر سے confirm کرایا گیا۔ وہ آیا اور اس نے تصدیق کر دی کہ فلر نے جو جواب نکالا ہے وہ درست ہے۔ اب ٹیچر نے بھی چاہا کہ اس کی ذہنی

استعداد کا امتحان لے۔اس نے وہیں ایک سوال پوچھا جس کا جواب اگرچہ بہت مشکل تھا مگر اس ٹیچر کو پہلے سے معلوم تھا۔فلر نے اس سوال کا جواب بھی چند سیکنڈز میں دے کر اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ایک غلام میں اتنی استعداد آئی کہاں سے!اس نے سوچا کہ یہ محض اتفاق ہے۔کوئی طویل اور مشکل سوال پوچھا جائے گا تو اس کے کس بل نکل جائیں گے۔مگر اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ فلر کی صلاحیت خداداد تھی۔وہ جو کچھ بھی کرتا تھا بہت حد تک غیر محسوس یا لاشعوری طور پر کرتا تھا اور اسی لئے اسے اپنے ذہن پر بہت زیادہ زور بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔خیر، اس ٹیچر نے فلر سے کہا کہ وہ ذرا 70 سال، 12 دن اور 12 گھنٹوں کو سیکنڈز میں تبدیل کر کے دکھائے! یہ کوئی آسان سوال نہیں تھا اور اس کے جواب کو لکھنے کے لئے وقت بھی درکار تھا۔فلر نے اس کا جواب صرف 90 سیکنڈز میں دے دیا۔
ٹیچر اور اس کے معاون نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ فلر کا جواب غلط تھا۔وہ دونوں بہت خوش ہوئے۔مگر فلر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔اسے یقین تھا کہ اس کا جواب درست تھا۔اس نے کہا، ''آپ لوگوں نے لیپ کے سال گنے ہیں؟'' ٹیچر کی پیشانی پر ندامت کے قطرے نمودار ہوئے۔فلر کا جواب درست تھا۔وہ لوگ لیپ کے سال گننا تو بھول ہی گئے تھے!

راتوں رات ٹام فلر دور دور تک مشہور ہو گیا اور اس کی ''مشہوری'' سے بھلا اس کا مالک کیوں نہ خوش ہوتا! وہ فلر کو بڑے فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا تھا۔کئی لوگوں نے اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی اور نہایت پرکشش قیمت دینے کا ارادہ ظاہر کیا مگر فلر کا مالک اسے کسی بھی قیمت پر بیچنے کیلئے تیار نہ ہوا۔وہ اسکالرز کو دعوت دیتا تھا کہ وہ آئیں اور اس سے حساب کے پیچیدہ سوال کریں اور حیران ہوں!لوگ آتے اور اپنے پیچیدہ سوالوں کے جواب پاتے مگر انہیں اس سوال کا جواب کبھی نہ ملا کہ آخر فلر کس طرح ان سوالوں کو لمحوں میں جواب کی منزل تک پہنچا دیتا ہے!

ٹام فلر کی ہی طرح نوکس ولے (امریکہ) کا چارلس کینسلر بھی ایک سیاہ فام غلام تھا اور اس کے ذہن کو بھی رسمی تعلیم سے ''آلودہ'' ہونے کا موقع نہیں ملا تھا! وہ لاکھوں کے شمار پر مبنی عدد کو کسی بھی عدد سے ضرب دے کر چند سیکنڈز میں جواب دے دیا کرتا تھا۔سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ جب بھی اپنی ذہنی استعداد کا مظاہرہ کرتا تھا تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی تھی اور جس بلیک بورڈ پر سوال لکھا جاتا تھا اس کی طرف اس کی پشت ہوتی تھی۔اور جب سوال لکھنے

کے بعد اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی جاتی تھی تب وہ بلیک بورڈ تک پہنچنے میں جو چار چھ سیکنڈز کا وقت لیتا تھا اسی کے دوران جواب سوچ لیتا تھا اور پھر بلیک بورڈ تک پہنچ کر جواب لکھنا شروع کر دیتا تھا!اس کی اس کارکردگی سے لوگ مبہوت سے ہو جاتے تھے۔خود کینسلر کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ یہ سب کیسے کر لیتا ہے!

جیڈ یا بیکسٹن 1707 میں انگلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔اس نے بھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا اور اس کے باوجود وہ حساب کتاب میں حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا۔اسے بچپن ہی سے ہندسوں اور اعداد سے دلچسپی تھی۔وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ گنتا رہتا تھا اور اس کی اس عادت سے اس کے گھر والے بہت تنگ تھے۔چرچ میں سروس کے دوران پادری کے خطبے سے اثر قبول کرنے کی بجائے وہ حساب لگاتا رہتا تھا کہ جو کچھ پادری نے کہا ہے وہ کتنے الفاظ پر مشتمل ہے۔
ہندسوں اور اعداد سے یہ محبت رنگ لائی اور اس نے جوانی میں اپنے ذہن کی قوت سے لوگوں کو کئی بار ورطۂ حیرت میں ڈالا۔ایک بار اس نے اس دور میں مروج ایک سکے **parthing** کو 139 سے ضرب کر کے پاؤنڈز میں اس کی قیمت معلوم کی۔جواب 39 ڈیجٹس میں تھا!

وہ کہاں سے آیا تھا؟

اس کی شخصیت میں ایسی ایک بات بھی ایسی نہیں تھی جس کی بنیاد پر اسے تہذیب سے آشنا قرار دیا جاتا۔ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا اس بارے میں سوچ سوچ کر لوگ حیران ہوتے رہے اور پھر انہوں نے اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

یہ پراسرار نوجوان کیسپر ہوزر کے نام سے مشہور ہوا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی اور دنیا سے آیا ہے اور اس دنیا کی ہر چیز اس کے لئے یکسر اجنبی ہے۔ وہ ہر معاملے خوف اور گھبراہٹ پر مبنی ردعمل کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ بہت سی چیزوں سے اسے واضح الرجی تھی اور وہ بہت سہا سہا رہا کرتا تھا۔

یہ 1828 ہوزر کی موجودگی کو سب سے پہلے جرمن شہر نیورمبرگ میں نوٹ کیا گیا۔ وہ خود تو صاف ستھرا تھا مگر اس کے بدن پر جو لباس تھا وہ چیتھڑوں سے کم نہیں تھا۔ اس کے پیر سوجے ہوئے تھے اور وہ چلنے میں بہت زیادہ دشواری محسوس کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چاروں طرف نہایت [illegible]ش نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے اس بات کا خوف ہو کہ کہیں سے کوئی آ کر اسے جان سے مار دے گا۔ ایک پولیس مین نے اسے روک کر نام پوچھا مگر وہ کچھ بھی بولنے سے قاصر تھا کیونکہ اسے بولنا آتا ہی نہیں تھا! کافی دیر تک پولیس میں اس کے ساتھ مغزپاشی کرتا رہا پھر اپنے افسر اعلیٰ کے پاس لے گیا۔ اس سے بھی یہ معاملہ درست نہ ہو پایا۔ نوجوان نے ایک ہی جملہ رٹا ہوا تھا...... ''میں بھی اپنے والد کی طرح سپاہی بننا چاہتا ہوں۔'' جب وہ یہ جملہ ادا کرتا تھا تو صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کے لہجے میں جذبات نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ کسی طوطے کی طرح رٹا ہوا جملہ دہرایا کرتا تھا۔

جب اسے کھانا دیا گیا تب چند دلچسپ باتوں کا علم ہوا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کھانا کھاتا

تھا۔ دودھ سے وہ بہت خوفزدہ تھا اور لاکھ زور دینے پر نہیں پیا۔ پانی کا گلاس پیش کیا گیا تو اس نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور انگلی کی مدد سے یہ دیکھا کہ اس میں کچھ ملا ہوا تو نہیں۔ اور پھر پی گیا۔

نوجوان کی جیب سے ایک بوسیدہ خط برآمد ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ اس کا باپ نیورمبرگ میں 6th کیولری میں افسر تھا اور سفارش کی گئی تھی کہ اس نوجوان کو بھی اسی کیولری میں بھرتی کر لیا جائے۔ ریکارڈز کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ اس نام کا کوئی آدمی مذکورہ کیولری میں نہیں تھا! یہ بات سب کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھی۔ خط میں اس کا نام نہیں بتایا گیا تھا۔ خود اس نوجوان نے اپنا نام کیسپر ہوزر لکھا۔ نیورمبرگ میں کہیں کوئی گھرانا ایسا نہ ملا جس کا کوئی بچہ ٹھیک انہیں دنوں گم ہوا ہو جن دنوں یہ نوجوان گم ہوا تھا۔

کیسپر ہوزر کئی دنوں تک شہر کے حکام کے لئے معمہ بنا رہا۔ وہ کئی چیزوں سے صاف بدکتا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اسے شہر کے ایک مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر ڈومر کے سپرد کیا گیا جو اسے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں بھی ہوزر نے بعض انتہائی عجیب وغریب حرکتیں کیں۔ اس نے شمع کی لو کو پکڑنے کی کوشش کر کے ڈاکٹر ڈومر کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے اسے بولنے کے قابل بنایا۔ ہوزر کے مطابق اسے بچپن ہی سے ایک کوٹھری میں رکھا گیا تھا اور کھانے کے لئے ہمیشہ سیاہ روٹی دی جاتی تھی جس کے ساتھ تھوڑا سا پانی ہوتا تھا۔

1829 میں ہوزر کو ایک نقاب پوش نے خنجر کا وار کر کے زخمی کر دیا۔ اس حملے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ شہر میں کوئی اسے نہیں جانتا تھا اور اس کی بھلا کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ اس واقعے کے بعد اس کی حفاظت کا معقول بندوبست کر دیا گیا۔

14 دسمبر، 1833 کی یہ بات ہے جب ہوزر اپنے محافظوں کے ساتھ ایک باغ کی سیر کر رہا تھا تب وہ چند لمحوں کے لئے محافظوں کی نظروں سے دور ہوا اور کسی نے کام دکھا دیا۔ ہوزر کو خنجر گھونپ دیا گیا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ باغ کے جس کونے میں ہوزر کو خنجر گھونپا گیا وہاں دور دور تک کوئی ذی نفس نہیں تھا! اور خنجر کا بھی کہیں نام ونشان نہیں ملا۔ اور یہ بات بھی معائنے سے واضح ہو گئی کہ وہ زخم ہوزر نے اپنے آپ کو نہیں لگایا۔ ہوزر اس زخم کی تاب نہ لا سکا اور اگلے ہی دن انتقال کر گیا۔

شانتی دیوی......دوسرے جنم کا قصہ

دہلی کی شانتی دیوی نے ایک دعوٰی کیا اور اس دعوے نے سائنس دانوں میں کھلبلی مچا دی۔ دعوٰی اس نوعیت کا تھا کہ لوگ چونکے بغیر نہ رہ سکے اور پھر بہت حد تک یہ مذہبی معاملہ بھی تھا اور ہندو اس حوالے سے کریڈٹ بھی لینا چاہتے تھے۔ سائنس دانوں نے اس پورے معاملے کا جائزہ لینے کے بعد یہ رائے دی کہ شانتی دیوی کا دعوٰی دھوکا دہی پر تو ہرگز مبنی نہیں تاہم سائنسی امور کے ماہرین کی حیثیت سے وہ اس موضوع پر پورے یقین سے اور ٹھوس دلائل کے ساتھ کوئی بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں۔!

شانتی دیوی کا دعوٰی کیا تھا اور وہ کیا ثابت کرنا چاہتی تھی، آیئے ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

یہ قصہ 1933 کا ہے۔

دہلی کے ایک متوسط گھرانے میں ایک بچی پیدا ہوئی۔ بچی کا نام شانتی دیوی رکھا گیا۔ جب وہ چار سال کی ہوئی تب والدین کو اندازہ ہوا کہ ان کی بیٹی بہت خاموش طبیعت کی واقع ہوئی ہے۔ اسے تنہائی میں رہنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی اور اپنی دھن میں ہی مگن رہتی تھی۔ اس کی عمر کی لڑکیاں جب گڑیوں سے کھیلتی تھیں تب وہ گھر کے کسی پرسکون کونے میں بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ یہ بات والدین کے لئے کچھ زیادہ تشویشناک نہیں تھی کیونکہ بچوں میں اس قسم کی سرگرمیاں پائی جاتی ہیں اور وہ عام طور پر اپنے آپ میں گم رہتے ہیں۔ مگر بڑبڑاہٹ کے سے انداز سے خود کلامی کرتے کرتے کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی کے مقابل بیٹھی ہے اور اس سے باتیں کر رہی ہے۔ گھر والے اس

کی اس حرکت سے بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ ان کی سمجھ میں اس کی کوئی وجہ نہیں آتی تھی۔ مگر کیا کیا جائے، یہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

شانتی جب سات سال کی ہوئی تب ایک دن اس نے ایک انتہائی چونکا دینے والی بات کہی اور پھر تو اس کے گرد پراسراریت کا حصار سا کھنچ گیا۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ پچھلے جنم میں متھرا میں رہ چکی ہے اور یہ کہ وہاں اس کا جو مکان تھا وہ بھی اسے یاد ہے! ماں بے چاری سیدھی سادھی عورت۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ جن ہندوؤں کے اعمال اچھے ہوتے ہیں وہ دوبارہ کسی نیک آدمی کے روپ میں جنم لیتے ہیں۔ اور برے کرموں کا پھل یہ ملتا ہے انسان اگلا جنم کسی جانور کی صورت میں لیتا ہے مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا دوسرا جنم لینے کا واقعہ خود اس کے گھر میں جنم لے گا! یہ ایسی بات نہیں تھی کہ ماں باپ نوٹ نہ کرتے۔ شانتی کا بچپن جس ڈھنگ سے بیت رہا تھا اس سے ان کے من میں جو خدشات پنپتے رہے تھے اب ان کی شدت میں اضافہ ہو گیا اور ساتھ ہی انہیں یقین ہو گیا کہ بچی کا دماغ درست نہیں! خاص طور پر ماں بہت پریشان تھی۔ اور جب ایک دن شانتی نے یہ بتایا کہ متھرا میں اس کی شادی ہوئی تھی اور تین بچے بھی ہوئے تھے تب تو واقعی ماں بے چاری بہت گھبرائی۔ اس نے شانتی کے باپ کو یہ بات بتائی تو وہ اسے لے کر ایک ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر کے لئے بھی یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس تھا۔ وہ ایک عام فزیشین تھا اور اس نوعیت کا کوئی کیس اس کے پاس آئے، اس کی کوئی گنجائش تھی ہی نہیں۔ اس نے شانتی کے کیس کو کسی نفسیات دان کے پاس بھیجنے کی بجائے خود اس پر تجربے کرنے کی ٹھانی! سات سال کی بچی جو باتیں کر رہی تھی وہ پختہ عمر کی کسی عورت کے منہ سے ہی نکل سکتی تھیں۔ ڈاکٹر نے شانتی کے باپ سے کہا کہ بچی سے وقتاً فوقتاً مختلف سوالات کرتے رہو اور جو بھی جواب وہ دے اسے لکھتے رہو اور بعد میں وہ پورا ریکارڈ چیک کراتے رہو۔

شانتی کا باپ بہت پریشان ہوا۔ اب اسے بھی یقین ہو چلا تھا کہ اس کی بچی کا دماغ درست نہیں۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی اور وہ بھی ایسی کہ جسے دیکھ کر دل دکھے! مگر اسے بھگوان کی مرضی سمجھ کر وہ لوگ صبر کے گھونٹ پینے پر مجبور تھے۔ خیر، ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ لوگ

شانتی کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتے رہے اور جو باتیں وہ کرتی تھی اس کا ریکارڈ تیار کرتے رہے اور ڈاکٹر کو دکھاتے رہے۔ اس ریکارڈ کی روشنی میں شانتی کا ''علاج'' جاری رہا۔ یہ علاج اعصاب کو سکون فراہم کرنے والی گولیوں پر مشتمل تھا۔ اس سے ذہن کا علاج تو کیا ہوتا اور نفس کی گرہیں تو کیا کھلتیں، شانتی غنودگی کی آغوش میں رہنے کی عادی ہوتی چلی گئی۔ چھوٹی سی بچی اور غنودگی لانے والی گولیاں! ماں باپ کو بھی یہ علاج پسند نہیں تھا مگر اسے وہ اس لئے جھیل رہے تھے کہ اس صورت میں شانتی کو ہر روز چند گھنٹوں کے لئے شانتی مل جایا کرتی تھی! اور جو سچ پوچھئے تو خود انہیں بھی!

بھرپور نفسیاتی علاج سے بچنے کی کوشش میں دن گزر رہے تھے۔

ایک دن دروازے پر دستک ہوئی۔ 9 سال کی شانتی دیوی اپنی ماں کے ساتھ باورچی خانے میں تھی۔ ماں نے کہا کہ جا کر دیکھو دروازے پر کون ہے۔ شانتی گئی اور دروازے سے گویا چمٹ کر رہ گئی۔ جب کافی دیر تک وہ واپس نہ آئی تو ماں کو تشویش ہوئی اور وہ دروازے پر گئی۔ اس نے دیکھا کہ شانتی ایک اجنبی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ شانتی نے بتایا کہ وہ شخص متھرا میں رہتا ہے اور اس کے ''شوہر'' کا رشتے دار ہے۔ وہ شخص بھی شانتی دیوی کی بات سن کر بہت حیران تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پر کیا ردعمل ظاہر کرے کیونکہ جس شخص کو شانتی اپنا ''شوہر'' بتا رہی تھی وہ شخص واقعی اس کا رشتے دار تھا! وہ دراصل کاروبار کے سلسلے میں شانتی کے باپ سے کوئی بات کرنے آیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ متھرا جا کر شانتی کے ''شوہر'' کو اس معاملے سے باخبر کرے گا۔

کچھ دنوں بعد متھرا کا وہ شخص دہلی آیا جسے شانتی اپنا ''شوہر'' قرار دیتی تھی۔ جب اسے اس کے مذکورہ رشتہ دار نے یہ بتایا تھا کہ 9 سال کی ایک لڑکی اسے اپنا ''شوہر'' بتا رہی ہے تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں رہی تھی۔ وہ ابتدا میں تو شانتی سے ملنے کے لئے تیار نہیں تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ معاملہ بہت گھمبیر ہے تو اس نے ایک بار شانتی سے ملنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس کی بیوی کو مرے ٹھیک 9 سال بیت چکے تھے۔ وہ شخص شانتی کے والدین کو اپنی آمد کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ وہ لوگ ذہنی طور پر اس منظر کے لئے تیار تھے۔

اسے دیکھتے ہی شانتی اس سے لپٹ گئی اور اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ یہ شخص اس کا ''شوہر'' ہے۔ شانتی کے والدین کو پتا نہیں کیوں یقین تھا کہ شانتی اس شخص کو اپنے ''شوہر'' کے روپ میں پہچان لے گی۔ مگر اس کے باوجود ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔

اس معاملے سے مقامی حکام کو آگاہ کیا گیا۔ وہ بھی بہت حیران ہوئے اور چند سائنسی ماہرین کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ اس معاملے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کریں۔ یہ معاملہ سائنس دانوں کے بس کا تو خیر تھا ہی نہیں اس لئے انہیں خواہ مخواہ زحمت دی گئی تھی اور وہ بے چارے بھی اس بات کو جانتے تھے کہ انہیں اس معاملے میں مفت میں الجھا دیا گیا ہے۔ مگر جس ''تحقیق'' کی ذمہ داری ان پر لادی گئی تھی وہ تو انہیں کرنی ہی تھی!

سائنس دان اور چند حکام شانتی کو متھرا لے گئے۔ ریلوے اسٹیشن سے گھر تک کا راستہ شانتی دیوی سے معلوم کیا گیا اور گاڑی میں سفر کے دوران اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ وہ راستہ ٹھیک بتاتی رہی! جب گاڑی اس گلی میں داخل ہوئی جہاں شانتی کا مبینہ سسرال تھا تب اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی اور اس نے ایک بوڑھے شخص کو اپنے سسر کے روپ میں شناخت کیا۔ اور وہ بوڑھا شخص واقعی لڈگی نام کی اس عورت کا سسر تھا جسے شانتی اپنا پچھلا جنم بتا رہی تھی۔ یہی نہیں بلکہ شانتی نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی پہچان لیا!

تیسرے بیٹے کو البتہ وہ نہ پہچان سکی۔ پہچانتی بھی کیسے؟ اس تیسرے بچے کو تو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا کیونکہ اس کی پیدائش کے دوران ہی تو وہ چل بسی تھی!

یہ سب کچھ بہت حیرت انگیز تھا اور بات پھیلی تو لوگ جوق در جوق اس مکان کی طرف آنے لگے جہاں شانتی اپنے ''سسرالیوں'' کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے سب کو شناخت کر لیا تھا یہ تو تھا ہی حیرت انگیز مگر ایک بات اور بھی تھی جو بہت حیرت انگیز تھی۔ شانتی متھرا میں اپنے مبینہ سسرالیوں سے مقامی بولی میں بات کر رہی تھی جبکہ اس کے ماں باپ نے اسے کبھی ہندی کے سوا کوئی بھی زبان یا بولی نہیں سکھائی تھی!

شانتی دیوی کے معاملے کا زیادہ منظم اور مدلل انداز سے جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی

قائم کی گئی اور اس کمیٹی میں سائنس دانوں اور نفسیات کے ماہرین کو شامل کیا گیا۔انہوں نے پورے معاملے کا بغور جائزہ لیا۔جب اس کیس کو اخبارات نے اچھالا تو پوری قوم اس میں دلچسپی لینے لگی۔ہندوؤں میں دوبارہ جنم لینے کا عقیدہ موجود ہے اور قدامت پرست ہندو اس کیس کو کیش کرنا چاہتے تھے۔کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ جو کچھ شانتی دیوی نے بیان کیا ہے اس کی سائنسی توجیہ تو ممکن نہیں ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ اس معاملے میں سچ ہی بول رہی ہے، کسی کو دھوکا نہیں دے رہی!

بعد میں شانتی دیوی نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تبدیل کیا اور شادی کر کے نارمل زندگی گزاری۔اس نے دہلی میں سرکاری نوکری کی۔

آسمان سے برف کا نزول

بہت قدیم زمانوں سے آسمان نہ جانے کیا کیا اس زمین پر برساتا رہا ہے۔ان میں کچھ چیزیں تو کام کی ہوتی ہیں اور کچھ ایسی ناگہانی ہوتی ہیں کہ ان کی آمد پر انسان کو صرف غصہ ہی آتا ہے۔کون ہوگا جس پر بجلی گرے اور وہ خوش ہو؟ اسی طرح آپ برف باری سے تو خوش ہوتے ہوں گے لیکن اگر آپ پر برف کے بڑے بڑے ٹکڑے گریں تو؟ اور اگر وہ ٹکڑے دس دس پندرہ پندرہ پاؤنڈز کے ہوں تو؟ ایسی صورت میں آپ کے لئے معاملہ بہت تشویشناک ہوگا اور آپ ایسے نزول کو یقیناً پسند نہیں کریں گے!

انگلینڈ میں برسٹل چینل کے ساتھ ساتھ شمالی ڈیون اور سمرسیٹ کا علاقہ بھیڑوں اور اون کے حوالے سے بہت مشہور ہے مگر 10 نومبر، 1950 کے بعد یہ علاقہ ایک اور حوالے سے مشہور ہوگیا۔ہوا یہ کہ ایڈورڈ لیتھم کا باڑہ رات بھر کتے کے بھونکنے کی آواز سے گونجتا رہا۔ایک بار لیتھم نے باہر آکر صورت حال کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی چور تو نہیں گھس آیا ہے۔مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔موسم بھی نارمل تھا۔اس کے باوجود کتا بھونک رہا تھا۔صبح لیتھم باڑے میں پہنچا تو اس نے ایک بھیڑ کو مردہ پایا۔ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی گردن پر کسی تیز دھار والے ہتھیار سے حملہ کیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔قریب ہی برف کی ایک سل پڑی تھی جس کا وزن پندرہ پاؤنڈز تھا۔برف کی یہ سل اس قدر تیزی سے زمین کی طرف آئی تھا کہ زمین میں آٹھ انچ تک گھس گئی تھی! وہاں تھوڑے سے فاصلے پر برف کے دوسرے بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔

معاملہ بہت اسرار تھا اس لئے برٹش ایئر منسٹری کے سپرد کیا گیا۔اس نے تحقیقات بعد اس واقعے کو بھول جانے کا مشورہ دیا۔جس رات یہ واقعہ رونما ہوا اس رات موسم بہت اچھا تھا اور

اس بات کو بھی خارج از امکان قرار دیا گیا ہوگا کہ ہوا میں سے برف گری ہوگی۔

ابھی اس واقعے کی گرد بیٹھی بھی نہ تھی کہ 24 نومبر، 1950 کو لندن کے نزدیک وڈ رورتھ کے مقام پر آسمان سے ایک کیوبک فٹ کا برف کا ایک ٹکڑا آیا اور ایک مکان کے گیراج کی چھت توڑتا ہوا زمین میں پیوست ہوگیا۔ برف کا ٹکڑا جب گیراج کی چھت سے ٹکرایا تب اس قدر زوردار دھماکہ ہوا کہ چوکیدار نے پولیس کو بلا لیا کہ کہیں بم تو نہیں پھٹ گیا ہے۔ اس کیس میں بھی برٹش ایئر منسٹری نے تحقیقات کے بعد بتایا کہ اس واقعے کا موسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ایسی بات نہیں ہے کہ یہ واقعات صرف انگلینڈ تک محدود رہے ہوں۔ اپریل، 1958 کی یہ بات ہے۔ نیپا، کیلی فورنیا (امریکہ) میں لیو کوزلو وسکی کے گھر کے نزدیک آسمان سے برف کے دو ٹکڑے آئے جو دو سے بارہ انچ قطر کے تھے اور ان کی رفتار اس قدر زیادہ تھی کہ جب یہ زمین سے ٹکرائے تو ایک دھماکہ سا ہوا اور لیو کوزلو وسکی نے دیکھا کہ یہ ٹکڑے اپنی نصف لمبائی کی حد تک زمین میں دھنس گئے! تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ جس وقت یہ واقعہ رونما ہوا اس وقت اس علاقے سے کوئی طیارہ نہیں گزرا تھا جس پر برف پھینکنے کا شبہ کیا جائے!

30 جولائی، 1957 کو ایسا ہی ایک واقعہ ریڈنگ، پنسلوانیا میں رونما ہوا۔ اس دن ایڈون گروف اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا کہ فضا میں سیٹی سی بجی اور چند ہی لمحوں میں دو فٹ قطر کی برف کی ایک سل فضا کو چیرتی ہوئی گروف سے کچھ فاصلے پر زمین سے ٹکرائی۔ اس کا وزن 50 پاؤنڈز سے زیادہ تھا۔ چند سیکنڈز تک تو ایڈون گروف حیرت زدہ کھڑا رہا کیونکہ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر اسے ذرا سا ہوش آیا اور اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ مگر اس سے پہلے کہ اس کی بیوی باہر آتی، برف کا ایک اور ٹکڑا اڑتا ہوا آیا اور گروف کے قریب ہی زمین میں گڑ گیا۔

گروف نے فوراً شیرف کو اطلاع دی۔ شیرف نے فائر بریگیڈ کو طلب کیا۔ فائر بریگیڈ نے موسمیات کے ماہر کو بلایا۔ موسمیات کے ماہر نے بتایا کہ زمین پر ہر طرف سے محیط ہوا کا سمندر بہت سی چیزوں کو لے کر چلتا ہے۔ یہ ہوا 300 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور برف کی یہ سلیں بھی اسی ہوا نے یہاں پہنچائی ہیں۔ اس کی بات میں وزن محسوس تو ہو رہا تھا مگر یہ نظریہ مسترد کر دیا گیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ زمین کی فضا پر محیط ہوا برف کی اتنی بڑی سل واڑاتی

حیرت انگیز واقعات

پھرے!

اسی سال 14 اگست کو گوون سٹی، پنسلوانیا میں پھر آسمان سے برف کی چند چھوٹی سلیں گریں۔ مگر معاملہ وہی رہا یعنی کوئی بھی یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ کیا ہو رہا ہے۔

8 ستمبر، 1958 کو چیسٹر، پنسلوانیا میں ایک بڑے ویئر ہاؤس پر برف کی چند سلیں آ کر گریں۔ ان سلوں کا وزن 10 سے 15 پاؤنڈز تھا۔ ان میں سے ہر سل کا قطر 4 سے 6 انچ تھا۔ ان سلوں پر تحقیق کی گئی تو کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ یہ بات کسی کا بھی ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ یہ سلیں خلا سے آ سکتی ہیں۔

اولڈ برج، نیو جرسی (امریکہ) میں دومینک گالپو اپنی بیوی کے ساتھ لیونگ روم میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ بہت دیر سے وہ کافی پینے کے موڈ میں تھے۔ کافی بنانے کے لئے وہ کچن میں گئے اور ابھی واپس آ کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک زبردست دھماکے سے کچن کی چھت پھٹ گئی اور جب میاں بیوی نے جا کر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ وہاں برف کی ایک بڑی سل پڑی تھی!

جب سورج ناراض ہوا!

آپ نے دن کے وقت مکمل اندھیرے کا سامنا کیا ہے؟ ایسے میں سب کچھ بہت ہیبت ناک لگتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو انسان کو ہر دور میں پریشان کرتی آئی ہے اور اس کے حوالے سی ہمیشہ پراسراریت کو محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ آج بھی اگر دن کے اوقات میں کہیں سورج اپنی روشنی سے یکسر محروم ہو جائے تو ہم اس کے نتیجے میں حیران رہ جاتے ہیں اور خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔ 11 اگست، 1999 کا دن بھی دنیا کے لئے ایسی ہی حیرت انگیز حقیقت لے کر آیا۔ اس دن جنوبی ایشیا میں سورج گرہن تھا اور تین سے چار منٹ کے لئے آسمان مکمل طور پر بے سورج ہو گیا اور تارے نکل آئے۔ یہ منظر دیکھ کر بہت سوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ سجدے میں گر پڑے۔ پاکستان میں بھی سورج روشنی سے محروم ہوا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایسا موقع صدیوں میں کبھی ایک بار آیا کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ سورج کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے ہوتے ہوئے آسمان تاریک کیوں ہو جاتا ہے؟ اس کی کئی وجوہ بیان کی جاتی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی وجہ اتنی مستند نہیں کہ اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا جائے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ زمین 18 ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے خلا کی وسعتوں میں اڑی جا رہی ہے۔ اس کا سفر مسلسل جاری رہتا ہے اور اس سفر کے دوران کئی سخت مقام بھی آتے ہیں۔ کبھی زمین کسی ستارے یا سیارے کی باقیات سے گزرتی ہے تو اس کے ذرات زمین کی فضا میں داخل ہو کر ایک فلٹر قائم کر دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایسا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس قسم کے کئی واقعات کا ریکارڈ دستیاب ہے اور اس ریکارڈ کا جائزہ بہت سی حیرت انگیز باتوں کو طشت ازبام کرتا ہے۔

26 اپریل، 1884 کا دن امریکی شہر پریسٹن کے لئے پریشانیاں لایا۔ دن کے وقت ایسا

اندھیرا چھایا جیسے کسی نے پوری فضا پر کمبل ڈال دیا ہو۔ لوگ بدحواس ہو کر گھروں سے نکل آئے۔ جانور اپنے لئے مختص جگہوں پر دبک گئے۔ اس صورت حال نے ان لوگوں کو عبادت کرنے پر مجبور کر دیا جو مذہب کی جانب زیادہ جھکاؤ رکھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اب دنیا کا خاتمہ ہونے کو ہے! آٹھ دس منٹ کے بعد سورج کی روشنی بحال ہو گئی اور زندگی معمول پر آ گئی۔ اس واقعے کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی جا سکی۔

امریکی ریاست منیسوٹا کے مقام ایٹکن نے بھی 12 اپریل، 1889 کو یہی تماشا دیکھا۔ اس دن سورج سر پر تھا اور اچانک ایسا گھنگھور اندھیرا چھایا کہ لوگ ڈر کے مارے گھروں میں دبک گئے۔

19 اگست، 1763 کی یہ بات ہے۔ لندن میں زندگی معمول پر تھی کہ اچانک سورج کی روشنی ماند پڑنی شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف ایسا اندھیرا چھایا کہ روشنی کئے بغیر کچھ بھی دیکھنا ممکن نہ رہا۔ ماہرین فلکیات نے حساب لگا کر بتایا کہ اس دن کوئی بھی گرہن نہیں تھا۔ پھر بھی یہ کیوں ہوا، اس کا ماہرین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

19 مارچ، 1886 کو اوشکوش، وسکونسن (امریکہ) میں دن کے تین بج کر پانچ منٹ پر مکمل تاریکی چھا گئی اور یہ عالم دس منٹ رہا۔ تاریکی کا یہ سفر کئی شہروں پر محیط تھا۔ مغرب سے سلسلہ شروع ہوا اور کئی مشرقی شہروں کو اپنی لپیٹ میں لیتا رہا۔ تین گھنٹوں تک یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔ کیا سورج کی راہ میں فلکی جسم آ گیا تھا؟ نہیں۔ تو پھر کیا کیا فلکی جسم کی راکھ یا ملبہ؟ اس سوال کا جواب بھی ماہرین نے نفی میں دیا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس معاملے کو بھی پراسرار قرار دے دیا گیا۔

2 دسمبر، 1902 کو میمفس ٹینیسی (امریکہ) میں صبح کے دس بجے جب لوگ کام پر جانے کے لئے گھروں سے روانہ ہوئے تو اچانک انہیں مکمل تاریکی نے آ لیا اور ایسے میں لوگ اس قدر بدحواس ہوئے کہ بھگدڑ مچ گئی۔ سب ایک دوسرے کو دھکیل کر اپنے اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں تھے کہ اگر دنیا کا خاتمہ ہونے کو ہے تو کم از کم گھر والوں کے سامنے تو مرنا نصیب ہو! یہ موقع بھی عبادات میں ڈوبنے کا تھا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک گرجا گھروں میں حاضری غیر معمولی طور پر زیادہ رہی۔ اس واقعے کی کئی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ لوگوں کو نفسیاتی طور پر سکون فراہم کرنے کے لئے کہا گیا کہ جنگل میں لگنے والی آگ سے دھواں پھیلا اور بلند ہو کر

اس نے سورج کے سامنے ایک انتہائی گھنیرا فلٹر قائم کر دیا اور اس کے نتیجے میں سورج کی روشنی کا زمین تک پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ ایک اور نفسیاتی توجیہ یہ پیش کی گئی کہ ریگستان سے اٹھنے والے ریتیلے بادلوں کے باعث سورج کی روشنی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی ہوئی۔

24 ستمبر، 1950 کو پورے امریکہ میں سورج کی روشنی اچانک مدھم پڑ گئی اور پھر سورج نیلے رنگ کا دکھائی دینے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کسی نے سورج کے سامنے فلٹر لگا دیا ہو۔

26 ستمبر کو یہی حال انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کا اور اس کے بعد ڈنمارک کا ہوا۔ ڈنمارک میں سورج دو گھنٹوں تک روشنی سے محروم رہا اور اس دوران لوگوں نے یہ سمجھا کہ دنیا ختم ہونے والی ہے اور اسی لئے انہوں نے اپنی رقوم نکلوانے کے لئے بینکوں کے باہر قطاریں لگا دیں! چار ممالک میں سورج کے اس طرح روشنی سے محروم ہو جانے کی توجیہ یہ پیش کی گئی کہ البرٹا، کینیڈا میں جنگل میں آگ بھڑک اٹھی تھی جس سے اٹھنے والے دھویں نے یہ گل کھلایا۔ مگر یہ توجیہ بہت بھونڈی ثابت ہوئی۔ ایک طرف تو دھواں مغرب کی سمت جا رہا تھا اور اسی دھویں نے مشرق کی جانب بھی سفر کیا!

یہ کیسی ہوا تھی جو بیک وقت دو سمتوں میں بہہ رہی تھی؟

نادیدہ دوستوں کی مدد سے!

آرتھر اسٹل ویل کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں عملی زندگی شروع کی اور ترقی کے زینے اس قدر تیزی سے طے کئے کہ دنیا انہیں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس نے کروڑوں ڈالرز کمائے اور چالیس شہر اور قصبے بسائے۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں پڑھئے تو یقین نہیں آتا کہ کوئی انسان اتنی تیزی سے اتنی زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔

آرتھر انتہائی غربت کے ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی شادی ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی تھی۔ سسرال والے اس کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر اس نے مدد لینے سے انکار کر دیا اور اپنے زور بازو کے سہارے آگے بڑھنے کو ترجیح دی۔ اس میں بلا کی خودداری تھی اور اس خودداری کا صلا بھی اسے خوب ملا۔ اس نے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ٹرک ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد ترقی کر کے کلرک بن گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ کلرکی میں بھی اتنا کہاں ملتا ہے کہ انسان پرسکون زندگی گزار سکے؟ آرتھر کی زندگی میں پریشانیاں تھیں اور وہ بھی خوش حالی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ مگر ہاں، اتنا ضرور تھا کہ وہ حالات سے مایوس نہیں تھا اور بہتر دنوں کی امیدوں میں رہنا پسند کرتا تھا۔ چھل کپٹ اس میں تھی نہیں اس لئے حرام کی کمائی کے بارے میں وہ سوچتا بھی نہیں تھا۔

شادی کے کچھ ہی دن بعد اسے چند سرگوشیاں سنائی دیں۔ ان سرگوشیوں میں اس کے لئے ایک ہی بات تھی...... ''مغرب کی سمت جاؤ اور ریل روڈ (ریلوے لائن) تعمیر کرو۔'' ان سرگوشیوں کو سن کر وہ تھوڑا سا پریشان ضرور ہوا مگر خوفزدہ ہرگز نہیں تھا کیونکہ وہ ان کا عادی تھا۔ اس نے یہ سرگوشیاں اس وقت بھی سنی تھیں جب وہ پندرہ سال کا تھا۔ اس وقت کسی نادیدہ وجود نے اس کے کان میں کہا تھا: ''چار سال بعد تمہاری شادی جینیو یوڈ نامی لڑکی سے ہو گی۔''

یہ بات آرتھر کے لئے بہت حیرت انگیز تھی۔ اس زمانے میں وہ اس نام کی کسی بھی لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ وہ ان دنوں ایک سرکاری اسکول میں پڑھ رہا تھا اور شادی کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے جب پانچ سال کے عرصے کے بعد نادیدہ دوستوں کی آوازیں دوبارہ سنیں تو سوچ میں پڑ گیا اور اپنی بیوی سے بھی مشورہ کیا۔ ان دوستوں کی ایک پیش گوئی تو درست ثابت ہو چکی تھی۔ آرتھر کی شادی جینی سے ہو چکی تھی اور جینی کا پورا نام جینیو یووڈ ہی تھا! اس نے جینی کو اپنے ان دوستوں اور ان کی پانچ سال پرانی پیش گوئی کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ دونوں نے نادیدہ دوستوں پر بھروسہ کرنا مناسب جانا۔ آرتھر نے نوکری چھوڑی اور بوریا بستر لپیٹ کر کنساس سٹی کی راہ لی۔ وہاں اس نے ایک بونڈ ہاؤس اور ایک بروکریج فرم میں ملازمت اختیار کی اور ریل روڈ بنانے کے خواب دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ بات کسی کے حلق سے بھلا کس طرح اتر سکتی تھی کہ چالیس ڈالر فی ہفتہ کمانے والا ایک کلرک ریل روڈ بنائے گا؟ اگر وہ یہ بات کسی سے کہتا تو وہ ضرور اس کا مذاق اڑاتا۔ مگر آرتھر کو اپنے ان پراسرار دوستوں پر بھروسہ تھا اور اسی لئے اس نے ان کے مشورے کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔

آرتھر ایماندار تھا۔ لوگ اس کی قدر کرتے تھے اور اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اس نے بینکوں سے بات کی۔ اسے قرضہ درکار تھا۔ بینک اسے قرضہ دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس نے ایک قطعۂ اراضی خریدا اور اس پر ریلوے ٹریک کی تعمیر شروع کر دی۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے کنساس شہر سے بیلٹ لائن تک ریلوے ٹریک تعمیر کر دیا۔ اس کارنامے نے اسے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی عام آدمی یہ کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

آرتھر نے کامیابی کا سفر جاری رکھا۔ اسے جب بھی کوئی پریشانی ہوتی تھی وہ اپنے نادیدہ دوستوں سے رابطہ کرتا تھا اور ان کے مشورے پر عمل کرتا تھا۔ اس سے پہلے کہ نیو یارک کے سرمایہ داروں کو خبر ہوتی، وہ کئی دوسرے بڑے منصوبوں پر کام شروع کر چکا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بستیاں بھی بساتا جا رہا تھا۔ اس کی محنت اور ایمانداری پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے بینک اسے قرضے دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔

آرتھر نے کنساس کے گندم کے کھیتوں کو میکسیکو کی خلیج سے ریل روڈ کے ذریعے جوڑنے کا

خواب دیکھا اور اس منصوبے پر بھی کام شروع کر دیا۔ یہ بہت حیرت انگیز منصوبہ تھا اور اس کی کامیابی کی پیش گوئی کرنے کو بہت کم لوگ تیار تھے۔ مگر آرتھر کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنی دھن کا پکا تھا اور پھر یہ کیا کم تھا کہ اس کے پراسرار دوستوں نے بھی اس منصوبے کو گرین سگنل دے دیا تھا۔ جہاں دیدہ افراد نے اس منصوبے کی مخالفت کی مگر 26 سالہ آرتھر کو اپنے آپ پر اور اپنے دوستوں پر بھروسہ تھا اس لئے وہ بھرپور رسک لینے کے لئے بھی تیار تھا۔

جب یہ منصوبہ گیلوسٹین شہر سے صرف پچاس میل دور رہ گیا تب ایک آرتھر کو اس کے پراسرار دوستوں نے بتایا کہ گیلوسٹین کی تباہی یقینی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس منصوبے کو وہیں سے موڑ کر ایک لمبا رستہ کاٹ کر آگے بڑھاؤ۔ آرتھر نے جب یہ کام اپنے کاروباری پارٹنرز کو بتائی تو وہ اس کا مذاق اڑانے لگے۔ مگر آرتھر اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے ایک نیا پوائنٹ منتخب کر کے ریل روڈ اس طرف سے آگے بڑھایا۔ اس جگہ اس نے ایک بستی بسا دی جو بعد میں اسی کے نام سے آباد ہونے والے شہر میں تبدیل ہوئی۔ سب کی مخالفت مول لے کر آرتھر نے ریلوے ٹریک کو مکمل کیا۔

کچھ عرصے کے بعد گیلوسٹین کو سمندری طوفان نے آ لیا۔ اس طوفان نے ایسی تباہی مچائی کہ لوگ ہوش بھلا بیٹھے۔ اس مصیبت کی گھڑی میں آرتھر اور اس کے پارٹنرز کی بنائی ہوئی ریلوے لائن ہی امدادی کارروائی میں کام آئی۔ اس وقت آرتھر کو اپنے پراسرار دوستوں پر فخر محسوس ہوا اور اس کے کاروباری پارٹنرز بھی اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ جس آرتھر کو لوگ ''سنکی'' کہہ رہے تھے اب اسے ''لکی آرتھر'' کہا جانے لگا۔ وہ بھی اس صورت حال کو انجوائے کرنے لگا۔

آرتھر نے سات سال کے عرصے میں سات ریلوے لائنیں بنوائیں اور چالیس شہر اور قصبے تعمیر کئے۔ ان میں دو شہر (پورٹ آرتھر، ٹیکساس اور اسٹل ویل، اوکلاہوما) اس کے نام پر ہیں۔

اسٹل ویل نے بھرپور زندگی گزاری۔ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اس نے تیس کتابیں لکھیں جن میں انیس ناول تھے۔ اس کی ایک کتاب

THE LIGHT THAT NEVER FAILED

ایک طویل عرصے تک ان کتابوں میں شامل رہی جو بہت زیادہ تعداد میں فروخت ہوتی

ہیں۔1910 میں آرتھر نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے بتایا کہ بہت جلد ایک جنگ ہوگی جس میں دنیا کی کئی اقوام حصہ لیں گی۔1914 میں آرتھر نے

TO ALL THE WORLD EXCEPT GERMANY

ایک کتاب لکھی جس میں اس نے پیش گوئی کی ایک عالمی جنگ میں جرمنی اور اس کے اتحادیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا، روس میں بادشاہت کا خاتمہ ہوگا، پولینڈ اور فن لینڈ کو آزادی نصیب ہوگی اور فلسطین ایک بار پھر یہودیوں کے کنٹرول میں چلا جائے گا۔ یہ ساری باتیں درست ثابت ہوئیں۔

آرتھر کا انتقال 1928 میں ہوا۔ پندرہ دن بعد جینی نے ایک بلند عمارت سے کود کر خودکشی کرلی۔

موت کے منہ سے واپسی

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی بڑی وہیل کے پیٹ میں پورے پندرہ گھنٹے گزارے اور پھر اپنا یہ تجربہ بیان کرنے کے لئے پورے اٹھارہ سال زندہ رہے؟ سائنس اس سوال کا جواب نفی میں دیتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔

یہ 1891 کی بات ہے۔ برطانوی بحریہ کا ایک ملاح جیمز بارٹلے اپنے پہلے غیر ملکی سفر پر تھا۔ یہ سفر ایک وہیلنگ شپ پر تھا یعنی وہ ان لوگوں کے ساتھ سفر پر نکلا تھا جو وہیل کا شکار کرتے تھے۔ ان کا جہاز ''اسٹار آف دی ایسٹ'' اس دن جنوبی بحرالکاہل میں ارجنٹائن کے فاک لینڈ جزائر کے نزدیک تھا جس دن یہ واقعہ رونما ہوا۔ یہاں وہیل کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دور دور سے لوگ اس علاقے میں وہیل کے شکار کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس دن بھی سب بہت اچھے موڈ میں تھے اور انہیں یقین تھا کہ آج وہ بہت بڑا شکار پائیں گے۔ ویسے بھی وہ وہیل مارنے کا ہی سوچ کر نکلے تھے۔

صبح کا وقت تھا اور موسم بہت اچھا تھا۔ پرسکون پانیوں میں سفر بڑے مزے سے کٹ رہا تھا۔ ایسے میں کسی کو جہاز سے نصف میل کے فاصلے پر ایک بڑی، جوان وہیل دکھائی دی۔ سمندر چونکہ سکون کی حالت میں تھا اس لئے اس وہیل کا شکار کرنے کی راہ میں بظاہر کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ شکاریوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور شکار میں استعمال ہونے والی خصوصی، چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر وہیل کی طرف چل پڑے۔ وہیل کے شکار میں استعمال ہونے والے ہارپونز ان کے پاس تھے۔ یہ لوگ تین کشتیوں میں سوار تھے اور سب سے آگے والی کشتی میں جیمز بارٹلے بھی سوار تھا۔ اس سے قبل اس نے وہیل کا شکار دیکھا نہیں تھا اس لئے اس کے ذوق وشوق کا عالم کچھ اور ہی تھا۔

وہیل بہت سکون سے ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی جیسے موسم سے لطف اٹھا رہی ہو۔ شکاری اس سے زیادہ سے زیادہ نزدیک جانا چاہتے تھے تاکہ ہارپونز اس کے جسم میں بہت اندر تک پیوست کرنے میں مدد ملے اور شکار میں بظاہر کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔ جب انہیں اندازہ ہوگیا کہ اب وہ سمندری عفریت پوری طرح ان کی گرفت میں آنے کے قابل ہے تب انہوں نے دو بڑے ہارپونز داغے۔ دونوں ہارپونز اس کے جسم میں بہت اندر تک چلے گئے اور چند ہی لمحوں میں وہ ادھ موئی سی ہوگئی کیونکہ اس کے جگر پر براہ راست حملہ ہوا تھا۔ عام طور پر وہیل ہلاک ہونے کے بعد سمندر کی تہ میں چلی جاتی ہے اور آٹھ دس گھنٹوں کے بعد دوبارہ سطح پر آجاتی ہے۔ مگر یہ بڑی سخت جان وہیل تھی۔ شدید زخمی ہونے کے بعد اس نے بپھر کر انہی کشتیوں کو نشانہ بنایا جن پر شکاری اور ان کے ساتھ بارٹلے سوار تھا۔ جب زخمی وہیل پاگل پن کے عالم میں دوبارہ سطح پر آئی تو سب کی سٹی گم ہوگئی اور جان کے لالے پڑ گئے۔ سب نے پیچھے ہٹنا شروع کیا اور ابھی وہ جہاز سے تیس چالیس گز دور تھے کہ وہیل نے اس کشتی کو نیچے سے ایک زوردار تھپڑ مار کر فضا میں بلند کر دیا جس پر بارٹلے سوار تھا۔ وہیل اپنی دم سے تھپڑ مارتی ہے اور یہ تھپڑ اس قدر زوردار ہوتا ہے کہ چھوٹا موٹا جہاز بھی ڈوب جاتا ہے۔ ایسے میں ایک چھوٹی سی کشتی کی بھلا کیا اوقات تھی؟ کشتی میں سوار تمام افراد فضا میں بلند ہوئے اور سمندر میں جا گرے۔ یہ بڑا ہی دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ سبھی اپنی جان بچانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے اور ایسے میں ظاہر ہے کہ چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہیل نے دم توڑ دیا اور گہرائی میں چلی گئی۔ پانیوں میں سکون ہوا تو سب نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ دو افراد غائب تھے۔ ان میں سے ایک تو جہاز کے پچھلے حصے سے چمٹا ہوا مل گیا مگر بارٹلے لاپتا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک تلاش کرنے کے بعد اس کے بارے میں یہ باور کر لیا گیا کہ وہ پہلے زخمی اور پھر ہلاک ہونے کے بعد ڈوب گیا ہوگا۔

شام کے وقت مردہ وہیل سطح پر آگئی۔ سب کی باچھیں کھل گئیں۔ موسم گرم ہو چلا تھا اس لئے مچھلی کا تیاپانچا کرنے کے معاملے میں تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سب نے مل کر

وہیل کو جہاز کی طرف گھسیٹا اور ایک بڑے تختے کو اس کے نیچے لے جا کر اس پر کھڑے ہوئے اور اس کا پیٹ چاک کرنا شروع کیا۔ پورا کا پورا معدہ نکال کر جہاز پر رکھ دیا گیا اور ساتھ ہی جگر بھی کاٹا گیا جو بے حد وزنی تھا۔ چند دیگر اعضا بھی کاٹ چکنے کے بعد وہ لوگ ستانے کے لئے جہاز کے عرشے پر بیٹھے اور خوش گپیاں کرنے لگے۔ اتنے کسی نے عرشے پر پڑے ہوئے وہیل کے معدے میں ہلچل محسوس کی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی سانس لے رہا ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ معدہ چیرا گیا تو پہلے ایک انسانی پیر دکھائی دیا اور اس کے بعد جوتے اور پلک جھپکتے میں پورے کا پورا بارٹلے بازیاب ہوگیا! وہ بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر نے اس پر محنت شروع کی اور اسے زندہ رہنے کے قابل بنانے میں پندرہ دن لگے۔ اور مکمل طور پر ہوش میں لانے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ اور اس نے ہوش میں آنے کے بعد اپنی کہانی سنائی تب لوگوں کو علم ہوا کہ ہوا کیا تھا۔

جیمز بارٹلے نے بتایا، ''جب وہیل نے نیچے سے کشتی کو ٹکر ماری تب کشتی کسی کھلونے کی مانند فضا میں بلند ہوئی اور میں بھی اڑنے لگا۔ جب میں نیچے آ رہا تھا تب میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا منہ میرا منتظر ہے۔ مت پوچھئے کہ میرا کیا حال ہوا۔ میرے حواس کو کیا ہوا، میں نہیں جانتا۔ میں نے اگلے ہی لمحے اپنے آپ کو وہیل کے منہ میں پایا۔ میں سخت بدحواس ہو کر چلانے لگا مگر وہاں میری چیخ پکار سننے والا کون تھا...... سوائے خدا کے! دانتوں سے معمولی سا زخمی ہوتا ہوا میں ایک بڑی نالی میں داخل ہوا اور وہاں سے پھسلتا ہوا میں پیٹ میں جا گرا۔ اور مجھے فوراً ہی سانس لینے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ خدا کی بہت بڑی مہربانی یہ ہوئی کہ میں چند ہی لمحوں میں بے ہوش ہوگیا۔ اور مجھے کچھ علم ہی نہ ہوا کہ اگلے پندرہ گھنٹوں میں مجھ پر کیا گزری۔ اور اب اس کیبن میں مجھے ہوش آیا ہے۔''

وہیل کے پیٹ میں پندرہ گھنٹے گزارنے والا بارٹلے مزید اٹھارہ سال زندہ رہا مگر ظاہر ہے اس نئی زندگی کی اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اسے بحریہ کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا اور اس نے اپنے آبائی قصبے گلوسسٹر میں موچی کی حیثیت سے دن گزارے۔ وہیل کے پیٹ میں گزارے ہوئے پندرہ گھنٹوں نے بارٹلے کے جسم کو تمام بالوں سے سدا کے لئے آزاد

کردیا۔ اس کی جلد غیر قدرتی سفید ہوگئی اور سب سے زیادہ اثر اس کی بینائی پر پڑا۔ وہ بمشکل دیکھ پاتا تھا۔ ہاں، سانس لینے میں بھی اسے دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر کچھ خاص نہیں۔ دنیا بھر کے طبی ماہرین اس سے ملاقات کے لئے آتے تھے اور اس سے اس کے انوکھے تجربے کے بارے میں پوچھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ بارٹلے کوئی زندگی کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی مگر اس کے لئے یہ اعزاز بھی کچھ کم نہیں تھا کہ اس نے ایک جوان وہیل کے پیٹ میں پورے پندرہ گھنٹے گزارے تھے۔ اور وہ اس حقیقت کو اپنے لئے واقعی ایک اعزاز گردانتا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا، لوگ اسے حیران ہوکر دیکھتے رہے۔

اسے ''ذہانت'' مار گئی!

وہ جتنا ذہین تھا اتنا ہی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس سے کچھ زیادہ، بدنصیب بھی تھا۔ جس چیز نے اسے بنایا اسی نے بگاڑ کے رکھ دیا اور وہ ایسا بگڑا کہ اپنے آپ کو پھر کبھی نہ بن سکا۔ وہ چار سال کی عمر میں سپر جینیس تھا اور چالیس سال کی عمر میں اس کی موت اس حالت میں ہوئی کہ کوئی اسے نہیں جانتا تھا اور اسے اس بات سے کوئی غرض تھی بھی نہیں کہ کوئی اسے جانتا ہے یا نہیں۔ وہ تو اس بات سے ہی بہت خوش تھا کہ اس نے زندگی کے آخری دن اس حالت میں گزارے کہ لوگ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ چکے تھے۔ وہ بچپن ہی سے اس بات کے لئے ترستا رہا تھا کہ لوگ اس کے بارے میں سوچنا اور باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتا تھا اور اس کے لئے کوئی بھی قیمت ادا کرنے کو تیار تھا اور اس بات کو اس نے ثابت بھی کیا۔

ولیم سڈس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بہت چھوٹی سی عمر میں بہت زیادہ حاصل کرتے ہیں مگر اسے برقرار نہیں رکھ پاتے اور آخر میں تھک ہار کر اس سے بہت کم پر راضی ہوجاتے ہیں جوان کا حق ہوتا ہے۔ ولیم نے محض چھ ماہ کی کومل سی عمر میں عملی زندگی شروع کی اور اس دور کے بڑے بڑے ماہرین بھی اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ چاندنی رات جیسا آغاز اماوس کی رات کی مانند تاریک ہوگا؟ سڈس انسان نہیں، ایک چوہا تھا جس پر طرح طرح کے تجربات کئے گئے اور یوں اس کی اپنی شخصیت کہیں گم ہوکر رہ گئی۔ نہیں نہیں، ولیم تھا تو انسان ہی مگر اسے چوہا بنا دیا گیا تھا جس کے مقدر میں ماہرین کے لئے تختۂ مشق بننا لکھا تھا۔ اسے اپنی اصلیت سے دور ایک ایسا جہاں بسانا تھا جس میں اس کے ساتھ صرف اس کی ذہانت ہو اور اسے اس حال میں زندہ رہنا تھا کہ کوئی بھی اس کا ہم پلہ نہ ہو۔

ولیم کے لئے یہ دنیا اس کے باپ نے بسائی تھی۔ بورس سڈس امریکہ کی عالمگیر شہرت یافتہ یونی ورسٹی ہارورڈ میں ایب نارمل سائیکولوجی کا استاد تھا۔ اس نے انسانی ذہن کی وسعتوں کے حوالے سے جو کچھ سوچا تھا اسے اپنے بیٹے پر آزمانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اپنے تمام نظریات کو بالکل درست ثابت کرنا چاہتا تھا مگر ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اسے اس مقصد کے حصول کے لئے ایک بہت بڑی قربانی دینی تھی۔ اسے اپنے بیٹے کی شخصیت پر اس کے اپنے کنٹرول کو ختم کرنا تھا۔ ولیم سڈس اسی حوالے سے بہت پریشان رہا کرتا تھا۔ اور پھر یہ ہوا کہ اس نفسیاتی گرہ نے اس کی زندگی کو اپنی لپیٹ میں اس طرح لیا کہ مرتے دم تک وہ اس بھول بھلیاں سے نکل نہیں پایا۔ وہ آزاد زندگی گزارنا چاہتا تھا مگر یہ اسے نصیب ہی نہیں ہوئی۔

جب ولیم صرف دو سال کا تھا تب اس نے ڈھائی سو الفاظ پر مشتمل دو مضامین لکھے جن ایک انگریزی میں تھا اور دوسرا فرانسیسی میں۔ اور ماہرین کو حیران کر دیا۔ جن لوگوں نے یہ ہوتے دیکھا وہ بھی اسے حقیقت ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کا ذہن اس بات کو قبول ہی نہیں کر رہا تھا کہ کوئی انسان اتنی چھوٹی سی عمر میں یہ کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ تسلیم کرنے سے انکار کر کے وہ حقیقت کو جھٹلا تو نہیں سکتے تھے۔

پانچویں سالگرہ کے موقع پر اس نے علم الابدان پر ایک مقالہ لکھا۔ دس سال کی عمر میں اس نے یونانی زبان میں جیومیٹری پر ایک مقالہ لکھا۔

جب ولیم پیدا بھی نہیں ہوا تھا تب بورس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے نظریات کے مطابق ذہنی پرورش فراہم کرے گا۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جس طرح جسم کے پٹھوں کو محنت اور تربیت سے ایک خاص سمت دی جا سکتی ہے اسی طرح ذہن کو بھی ایک خاص سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

ننھے ولیم کے بستر پر ہر طرف انگریزی کے حروف تہجی فٹ کر دیئے گئے تھے۔ جب ولیم چھ ماہ کا تھا تب سے وہ ہر حرف کو اچھی طرح پہچان سکتا تھا اور یوں اس نے بولنا سیکھا تو ساتھ ہی ساتھ سوچنا اور لکھنا بھی سیکھ لیا۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اور بورس نے اس کا کریڈٹ بھی خوب لیا۔ اور جب ولیم دو سال کا ہوا تب تک اس نے کسی میچور انسان کی مانند لکھنا سیکھ لیا تھا۔

گھر پر ولیم کی تربیت بہت سخت ماحول میں کی گئی۔ بچوں کو نرسری کی جو پیاری سی نظمیں

پڑھنے کو ملتی ہیں وہ اس کے لئے شجر ممنوعہ تھیں۔ اسے جیومیٹری، ریاضی اور سائنس کی دقیق کتابوں میں سر کھپانا پڑتا تھا۔ یہ سب بورس کا طے کردہ تھا۔ اس معاملے میں ولیم کی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس کا ذہن ایسی بہت سے باتوں سے نا آشنا تھا جو بچوں کی زندگی کا لازمی جز ہوا کرتی ہیں۔ بورس نے غیر معمولی منصوبہ بندی کے ذریعے اس کے ذہن کو کئی اہم معاملات کے لئے خالی چھوڑ رکھا تھا اس لئے وہ اپنے باپ کی منصوبہ بندی کے مطابق بہت کچھ بڑی تیزی سے سیکھتا چلا گیا۔ اور دنیا نے ایک جینیئس کو بڑی تیزی سے ابھرتے دیکھا۔ بورس کے لئے یہ سب بہت خوش کن تھا مگر اس کی ماں بہت دکھی رہا کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا نارمل زندگی گزارے۔ اور وہ بے چارا ایسی زندگی گزار رہا تھا جس میں نہ تو پریوں کی کہانیاں تھیں اور نہ ہی ماں کی گود کا لطف۔ ولیم کی دیکھ بھال آیاؤں کے ذمے تھی۔ بورس اسے اپنے نظریات کی چلتی پھرتی تجربہ گاہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔

ولیم کے ذہن پر بہت چھوٹی عمر میں وہ بوجھ لادا گیا تھا جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا جو نتیجہ نکلنا چاہئے تھا وہ نتیجہ نکلا بھی مگر اس بات کو بورس سمجھنے سے قاصر رہا۔ جب کسی مسئلے پر غور کرتے وقت ولیم کے ذہن پر بہت زیادہ دباؤ پڑتا تھا تب وہ گھبرا جاتا تھا اور ساتھ ہی اس پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی اور اس کے نتیجے میں وہ ہکلانے لگتا تھا۔ یہ ہکلاہٹ محض ہکلاہٹ نہیں تھی بلکہ اس کا اثر اس کی ذہنی استعداد پر بھی مرتب ہوتا تھا اور یوں وہ بہت سی ایسی باتیں بھی اپنی ذہنی حدود میں نہیں لا پاتا تھا جو بظاہر بہت آسان بلکہ **common** تھیں۔ کسی بھی جینیئس کے لئے ہمیشہ یہ بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ بہت عمومی سی بات کو ہی آسانی سے سمجھ نہیں پاتا! ولیم کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ بہت آسان امور میں الجھ جایا کرتا تھا۔ اور اس بات پر لوگ حیران ہوتے تھے اور کبھی کوئی اس حوالے سے اس پر طنز کرتا تھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جایا کرتی تھی۔

1912 میں ولیم نے چوتھی سمت کے بارے میں اس موضوع کے ماہرین کے سامنے لیکچر دیا اور اس ایک لیکچر نے اسے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ماہرین حیران تھے کہ آخر یہ لڑکا ہے کیا چیز۔

ولیم نے 13 سال کی عمر میں ہارورڈ یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا اور اس حوالے سے کئی ممالک کے اخبارات نے اسے غیر معمولی کوریج دی۔ مغرب کے لئے یہ بہت بڑی کامیابی تھی

اور ظاہر ہے کہ اسے کیش کرانا اس کا حق تھا۔ مگر خود ولیم کو یہ سب پسند نہیں تھا۔ وہ مکمل نارمل زندگی گزارنا چاہتا تھا اور اس کے لئے کوئی بھی قربانی دینے کے لئے تیار تھا۔ اور یہی سبب ہے کہ اس نے اپنے باپ سے بغاوت بھی کی۔

تعلیم مکمل ہوئی تو ولیم کو روزی روٹی کی فکر ستانے لگی۔ اس نے ہوسٹن کے رائس انسٹی ٹیوٹ میں پڑھانا شروع کیا۔ یہاں سے اس کی مشکلات کا آغاز ہوا۔ وہ علم تو بہت رکھتا تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ لوگوں سے کس طرح ملتے ہیں اور کسی بھی معاملے میں ان سے بات اور ڈیلنگ کس طرح کرتے ہیں! اس کے باپ نے اسے اس معاملے میں سراسر کورا رکھا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کسی سے بات کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا مگر جس چیز کو جانتا تھا اسے بانٹنا نہیں جانتا تھا۔ جس ہائی اسکول میں وہ پڑھاتا تھا وہاں کسی سے اس کی نہیں بنی اور اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کی ذہنی سطح بہت بلند تھی۔ بہت سے لوگ اس سے خائف رہتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس سے حسد بھی کرتے تھے۔ اس کے طلبا بھی اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یہ بات اس سے ہضم نہیں ہو پائی اور یوں اس نے یہ نوکری چھوڑ دی۔

سچ تو یہ ہے کہ اس نے نوکری چھوڑی نہیں بلکہ نوکری اسے چھوڑنا پڑی۔ ایک بار کسی مسئلے پر وہ اسکول کے ایک ٹیچر سے ہاتھا پائی کر بیٹھا اور معاملہ کورٹ کچہری تک پہنچا جہاں اسے اٹھارہ ماہ کی معطل سزا دی گئی۔

اس کے بعد اس کا بہت طویل عرصے تک کچھ سراغ نہ ملا۔ ایک دن اس کے باپ کے ایک دوست نے اسے ایک سپر اسٹور میں پایا۔ وہ وہاں کلرک کی حیثیت سے کام کر رہا تھا! علم کی بلندی اور عمل کی پستی کی ایسی مثال لوگوں نے کم کم دیکھی ہوگی۔ اس کی تنخواہ 23 ڈالر فی ہفتہ تھی۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اس تنخواہ میں بہت خوش تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسی کے لئے تو وہ ترستا رہا تھا۔ اپنے باپ کے دوست کے زور دینے پر وہ ایک بار پھر دنیا کے سامنے آیا اور اس نے ایک بڑے تعلیمی ادارے میں ”مریخ پر زندگی کے امکانات“ کے بارے میں لیکچر دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ جو لوگ اسے بھول چکے تھے وہ ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور لیکچر ہال میں ولیم سڈس نے اپنے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے لیکچر کا منتظر پایا۔ ان میں سے کسی کی بھی نظر میں طنز کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ وہ بہت خوش ہوا مگر جب وہ لیکچر دینے کھڑا ہوا تب اندازہ ہوا کہ یہ اب خیالات کو

ترتیب دینا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے باپ نے بچپن میں ذہن کو وسعت دینا سکھایا تھا مگر اس کے بعد وہ ذہن پر پڑنے والے دباؤ کے باعث اس پریکٹس کو ترک کر چکا تھا۔ اب ایک دقیق موضوع پر بولنے کا مرحلہ آیا تو اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا اور وہ مریخ پر زندگی کے امکانات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی بجائے نہ جانے کیا کیا اول فول بکنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سلسلۂ کلام گاڑیوں کی خرید و فروخت تک دراز ہوا!

ولیم کے ذہن کی یہ حالت اس کے باپ نے کی تھی اس لئے فطری طور پر اسے اپنے باپ سے بے انتہا نفرت ہوگئی اور اس نے انتہائی غربت کی زندگی گزارنا پسند کیا مگر باپ کے ترکے میں سے ایک پائی بھی لینا گوارا نہیں کیا! دوسری جنگ عظیم کے دوران، **1944** کی گرمیوں میں، ولیم سڈس بروک لائن کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں نمونیا میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا اور کسی نے اس کی موت کا نوٹس بھی نہیں لیا۔

وایومنگ کی پراسرار ممی

لاشوں کوحنوط کرنے کے حوالے سے سب سے مشہور نام مصر کا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مصر میں اس فن کی ابتدا ہوئی اور وہیں یہ فن اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا۔ آج بھی دنیا بھر میں جتنی بھی ممیز یعنی حنوط شدہ لاشیں پائی جاتی ہیں ان کی ایک بڑی تعداد مصر سے تعلق رکھتی ہے۔

جنوبی امریکہ میں بھی مایا تہذیب کے آثار معلوم کرنے کے لئے کی جانے والی کھدائی کے دوران بہت سی حیرت انگیز چیزیں دریافت ہوئیں اور اسی دوران سونے کی تلاش میں گرینائٹ کی کانوں والے علاقے میں کھدائی کرنے والوں کوایک ایسی ممی ملی جس نے ماہرین کواب تک ورطۂ حیرت میں ڈالا ہوا ہے اور وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اس ممی کی حقیقت کیا ہے۔

یہ ممی 14 کی قامت والے کسی انسان کی ہے۔ یہ اس قدر پرانی ممی ہے کہ ابھی تک اس کی متوازی کوئی بھی ممی دریافت نہیں ہوئی ہے۔ کیسپر (وایومنگ) میں سونے کی تلاش میں کھدائی کرنے والوں کو یہ ممی ملی تھی اور انہوں نے اس کی موجودگی سے مقامی حکام کو آگاہ کیا۔ یہ اکتوبر 1932 کی بات ہے۔ ممی دراصل گرینائٹ کے ایک بہت بڑے پتھر کے اندر سے ملی تھی۔ ممی کسی بندر نما انسان کی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے ہوئے ہیں۔

ماہرین نے اس بات کو خارج از امکان قرار دیا کہ وہ شخص کسی وقت حادثے کے نتیجے میں غار کے اندر دفن ہو کر محفوظ ہو گیا ہوگا۔ ایکس رے سے جائزہ لینے سے پتا چلا کہ اس کا دماغ کسی پختہ عمر کے انسان کا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق مرتے وقت اس کی عمر 65 سال رہی ہوگی۔ وہ اپنی جسمانی پرداخت کے تمام مراحل پورے کر چکا تھا۔ اس کا وزن 12 اونس تھا۔ ماتھا اور نتھنے چوڑے تھے۔ ناک چپٹی تھی۔ ٹھوڑی بہت ہی چھوٹی تھی۔ تمام دانت سلامت

تھے۔ اس شخص کی موت کب واقع ہوئی ہوگی اس حوالے سے ماہرین خاموش ہیں۔

ہارورڈ یونی ورسٹی کے بشریات کے شعبے نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ اصل ممی ہے اور یہ مرتے وقت مذکورہ انسان یا انسان نما حیوان 60 ساک سے زیادہ کا تھا۔

امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں بشریات کے شعبے کے سربراہ ڈاکٹر ہنری شیپرو نے بتایا کہ یہ ممی ادھیڑ عمر والے کسی حیوان کی ہے اور ہم اسے انسان قرار نہیں دے سکتے۔ ہوسکتا ہے یہ ممی انسان کے اجداد میں سے کسی کی ہو۔

بہرکیف، یہ ممی کسی بھی دوسری ممی کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے اور ماہرین اس کے بارے میں اب بھی مستند طور پر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

وہ دماغ تھا یا ایکس رے مشین؟

اس دنیا میں حیرت انگیز لوگوں کی کبھی کوئی کمی نہیں رہی۔ کسی کو آپ نے ہر بات یاد رکھتے دیکھا ہوگا۔ کوئی آپ کو بڑی پھرتی سے آنکھوں میں دھول جھونکتا دکھائی دے گا۔ سڑکوں پر آپ نے بہت سے شعبدے باز دیکھے ہوں گے جو مجمع لگا کر، ہاتھ کی صفائی دکھا کر نظر بندی کرتے اور آپ سے داد وصول کرتے ہیں۔ مگر یہ تو وہ مہارت ہے جو حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایسے لوگ اگرچہ کم ہوتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں جو قدرتی طور پر انتہائی حیرت انگیز صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں اور انہیں بروئے کار لاکر دوسروں کو صرف حیران ہی نہیں کرتے، ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں ہالینڈ کا پیٹر ہرکوس بھی تھا جو کسی بھی چیز کو ہاتھ لگا کر اس سے وابستہ بہت سے حقائق بڑی آسانی سے بتا دیا کرتا تھا اور یہ بات اسے خود بھی نہیں معلوم تھی کہ وہ ایسا کرنے میں کس طرح کامیاب رہتا ہے۔ اسے تو بس اس بات سے غرض تھی کہ اسے قدرت نے ایک صلاحیت سے نوازا تھا اور وہ اس صلاحیت کے فیضان سے دنیا کو محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو اس کی صلاحیتوں کی ضرورت پڑی۔ اس نے بخوشی ان کی مدد کی اور مسئلہ اس طرح حل ہوگیا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ بات یہ تھی کہ کسی نے لندن کے مشہور قبرستان ویسٹ منسٹر ایبے سے ایک یادگار پتھر چرا لیا۔ اس کی تلاش میں رات دن ایک کر دیئے گئے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر تھک ہار کر اسکاٹ لینڈ یارڈ کے افسران اعلیٰ نے ہرکوس سے رابطہ کیا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کسی بھی قیمت پر چوروں کا سراغ چاہتا تھا اور اس کے لئے وہ کسی کی بھی مدد قبول کرنے یا اس سے مدد مانگنے کو تیار تھا۔

دسمبر، 1950 کا یہ واقعہ ہے۔ چوروں نے کئی ایک کوتاہیاں کی تھیں مگر اس کے باوجود پولیس ان تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ نے ہرکوس سے مدد لی اور کامیاب رہے مگر اخبارات کی غیر معمولی تنقید کا نشانہ بھی اسی کو بننا پڑا۔ ایک روشن خیال معاشرے میں یہ بات بہت عجیب لگتی تھی کہ پولیس جیسا محکمہ سائنسی بنیادوں پر محنت کرنے کی بجائے کسی ایسے انسان کا سہارا لے جو غیر معمولی صفات کا حامل ہے!

ڈورڈ یکٹ میں ہرکوس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے درمیان معاملات طے پائے۔ اسے لندن لایا گیا جہاں اس نے ویسٹ منسٹر ایبے کا جائزہ لیا۔ جس جگہ سے وہ یادگار پتھر چرایا گیا تھا وہیں ایک چور کی دستی گھڑی اور ایک اوزار ملا۔ اور ساتھ ہی اسکاٹ لینڈ یارڈ کے حکام نے ہرکوس کو لندن کا نقشہ بھی فراہم کیا۔ ہرکوس کبھی پہلے لندن نہیں آیا تھا مگر اوزار اور دستی گھڑی پر ہاتھ رکھتے ہی اس نے ان کے ممکنہ ٹھکانے کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے لوگ یہ سوچ کر حیران رہ گئے کہ وہ نقشے میں ایک ایک چیز کی نشاندہی درست کر رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ جن لوگوں نے وہ پتھر چرایا ہے ان میں تین مرد اور ایک عورت شامل تھی۔ اور جب گرفتاری عمل میں آئی تب اس کی بات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہرکوس زیر زمین کام کرنے والے حریت پسندوں کی مدد کرتا رہا۔ جب بھی انہیں کسی پر شک ہوتا، وہ ہرکوس کی خدمات حاصل کرتے اور یوں وہ اپنی بہت سی مشکلات کو دور کرنے میں کامیاب رہتے۔ ایک بار وہ کسی کی تصویر لے کر اس کے پاس آئے اور اس کے بارے میں رائے پوچھی۔ ہرکوس نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ جواب ملا کہ وہ ایک حریت پسند ہے اور بہت سے کارروائیوں میں حریت پسندوں کے ساتھ رہتا ہے مگر بعد میں اس پر شک ہوگیا اور اب حریت پسند چاہتے تھے کہ اس کے بارے میں حقائق سے آگاہی ہو جائے۔ ہرکوس نے اس کی تصویر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ میں اس شخص کو جرمن فوجی افسر کی وردی میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اس کی بات درست تھی۔ وہ شخص جرمنوں کا جاسوس تھا اور چھپ چھپ کر رپورٹیں بھیجا کرتا تھا۔ جب چار تھپڑ پڑے تو

اس نے سب کچھ اگل دیا!

اگست، 1951 میں ہالینڈ کے ایک قصبے نجمیگین اور اس سے ملحق علاقے میں آگ لگ گئی۔ آگ اتنی شدید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک بہت وسیع علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حیرت کی بات یہ نہیں تھی کہ آگ صرف پھیل رہی تھی بلکہ لوگ اس بات سے پریشان تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نئی آگ لگ رہی تھی اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ہرکوس بھی بہت فکرمند تھا۔ اس کے وطن میں آگ لگی تھی اور وہ سکون سے بیٹھتا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک دن اپنے ایک دوست کے ہمراہ آتشزدگی کے مقامات کا معائنہ کرنے کے بعد چند عجیب باتیں محسوس کیں اور پولیس کی مدد کرنے کی ٹھانی۔ مگر پولیس اس سے مدد لینے پر رضامند نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب ماہرین کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکے تو وہ کیا کرے گا! مگر وہ ہرکوس کی صلاحیتوں سے واقف نہیں تھے۔ جب پولیس کا اعلیٰ افسر اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہ ہوا تو اس نے اس افسر کی جیب میں پڑی ہوئی تمام چیزوں کے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ یہ بات تو بہت حیرت انگیز تھی۔ وہ افسر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ہرکوس کو ساتھ لیا اور ایک ایسے علاقے میں لے گیا جہاں غیر معمولی آتشزدگی نے سب کچھ خاکستر کر ڈالا تھا۔ وہاں چند چیزیں راکھ کے ڈھیر میں ملیں۔ ہرکوس نے ان چیزوں کی مدد سے اندازہ لگا کر بتایا کہ ایک نوجوان آگ لگاتا پھر رہا ہے۔ پولیس اس کی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اور جب ہرکوس نے اس نوجوان کا حلیہ بتایا تو وہ اور پیچھے ہٹ گئے کیونکہ وہ حلیہ شہر علاقے کے ایک رئیس کے بیٹے کا تھا! مگر ہرکوس اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے کہا کہ اپنی بات کی صداقت پر وہ شرط لگا سکتا ہے۔ اور جب اس کی جانب سے زور دینے پر پولیس نے مذکورہ نوجوان سے پوچھ گچھ کی تو اس نے تھوڑی ہی دیر میں اعتراف کر لیا کہ وہی جگہ جگہ آگ لگاتا پھر رہا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ محبت میں ناکام ہو گیا تھا اور اب دنیا سے انتقام لینا چاہتا تھا! پولیس نے اسے پاگل خانے بھجوا دیا اور ہرکوس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ایک خطرناک مجرم کو گرفتار کرنے میں اس کی معاونت کی۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا اور ہالینڈ ہی نہیں، بلکہ دیگر ممالک کے اخبارات میں بھی اس کے کارنامے کو بہت نمایاں طور پر شائع کیا گیا مگر ہرکوس

ستائش کی تمنا سے بے نیاز تھا۔ وہ تو بس اس بات کے لئے تیار رہتا تھا کوئی اس کے صلاحیتوں سے استفادہ کرے۔

ایک بار ایک شخص کو اس کے گھر کے دروازے پر ہی قتل کر دیا گیا۔ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کا جائزہ لے کر ہرکوس کوئی اندازہ قائم کر سکتا۔ اس نے مقتول کے کوٹ کو چھو کر چند لمحوں تک فضا میں ایک ہی سمت گھور کر دیکھا اور پھر بتایا کہ قاتل بوڑھا ہے اور اس کے ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔ اس نے اپنی لکڑی کی وہ ٹانگ ایک چھت پر پھینک دی تھی۔ تفتیش کرنے پر اس کی بات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔

1958 میں ہرکوس کو امریکہ لایا گیا جہاں نفسیات کے ماہرین کی ایک ٹیم نے اس سے تفصیلی انٹرویو کیا اور اس کی خداداد صلاحیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ بہت کوشش کرنے پر بھی وہ کوئی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں نہ آ سکے۔

بچے کے پیٹ میں بچہ

"ابے اپنا علاج کرا۔ کہیں تیرے پیٹ میں کوئی بچہ....."

"ارے بہن، ذرا دیکھنا تو۔ گھور کل جگ ہے۔ مرد کے پیٹ میں بچہ لگتا ہے پر لے کال اب زیادہ دور نہیں۔"

"ذرا بھی شرم نہیں آتی اتنا بڑا پیٹ لے کر شہر بھر میں گھومتے ہوئے۔"

یہ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے جملے سنتے سنتے سنجو بھگت تنگ آ چکا تھا۔ سنجو کی عمر 36 سال ہے۔ اس کی زندگی بھارتی ریاست مہاراشٹر کے شہر ناگپور میں گزری تھی۔ اس کا پیٹ بچپن ہی سے پھولا ہوا تھا۔ اس کے والدین نے کبھی اس طرف خاص توجہ نہیں دی۔ ان کا خیال تھا کہ گیس کی تکلیف کے باعث سنجو کا پیٹ پھولا ہوا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس تکلیف کا ازالہ ہو جائے گا۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ سنجو کی تکلیف بڑھتی چلی گئی۔ لوگوں نے اس میں غیر معمولی دلچسپی لینے کا آغاز کیا۔ اس کا پھولا ہوا پیٹ لوگوں کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ عورتیں اسے دیکھ کر شرم سے منہ دوسری طرف کر کے سرگوشیاں شروع کر دیتی تھیں۔ بچے اسے دیکھ کر تالیاں بجاتے تھے کیونکہ ایسا نظارہ انہیں کم دکھائی دیتا تھا۔

سنجو جب جوان ہوا۔ تب اس کی تکلیف غیر معمولی ہوگئی۔ ایک طرف تو اس کا پیٹ پھولتا چلا گیا اور دوسری طرف وہ سانس لینے میں غیر معمولی دشواری محسوس کرنے لگا۔ کئی ڈاکٹرز نے اس کا چیک اپ کیا مگر وہ اس کی بیماری کے بنیادی اسباب نہ جان سکے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سنجو "پیٹ سے" ہو سکتا ہے۔ جولائی 1999ء میں سنجو نے تکلیف کی شدت محسوس کی اور یوں ڈاکٹر اس کے پیٹ کا آپریشن کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ جب سنجو کو سانس

لینے میں واضح دشواری محسوس ہونے لگی اور چند مواقع پر وہ بے ہوش بھی ہوا تب اس کے آپریشن کا فیصلہ کیا گیا۔ آپریشن کے لیے ممبئی کے ٹاٹا میموریل ہاسپٹل کو منتخب کیا گیا۔ ماہرین کی ایک ٹیم نے اس کا چیک اپ کیا۔ ایسے پیچیدہ کیسز میں آپریشن کوئی معمولی کام نہیں ہوتا۔ سنجو کے دل کی دھڑکن کا جائزہ لیا گیا۔ ڈاکٹر اس امر کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ آپریشن کے دوران کوئی بڑی پیچیدگی پیدا نہ ہو اور سنجو کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہ ابھرے۔

سنجو کا آپریشن کرنے والی ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر اجے مہتا نے بتایا کہ جب آپریشن کیا گیا تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سنجو کے پیٹ میں کوئی بچہ ہوگا۔ پیٹ چیرنے پر اچھا خاصا خون بہا تھا۔ کچھ ہاتھ اور کچھ بال باہر آئے۔ ہاتھوں کے ناخن خاصے لمبے تھے۔ سنجو کے پیٹ میں 36 سال سے پلنے والا بچہ دراصل اس کا جڑواں بھائی تھا! میڈیکل ہسٹری میں اب تک ایسے 90 کیس ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ رحم مادر میں پلنے والے بچے کے جسم میں بھی بچہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ بچے کے پیٹ میں پلنے والے بچے کو بھی ایک نالی کے ذریعے خوراک ملتی رہتی ہے۔ جب بچے کو جنم ملتا ہے تو دوسرا بچہ اس بچے کے پیٹ میں پلتا رہتا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ عام طور پر اس طرح کے کیسز میں پیدا ہونے والا بچہ زندہ نہیں رہ پاتا کیونکہ اس کے جسم پر غیر معمولی دباؤ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ بچے کے پیٹ میں پلنے والا بچہ چونکہ خوراک کا بڑا حصہ ہڑپ کر لیتا ہے۔ اس لئے بچے کے بچنے کا امکان خاصا معدوم ہوتا ہے۔ سنجو بھگت کا کیس اس لحاظ سے بے حد دلچسپ اور حیرت انگیز تھا کہ اس نے کم و بیش 30 سال تک اپنے جڑواں بھائی کو کسی نہ کسی شکل میں اپنے پیٹ میں رکھا اور پالا۔ سنجو کا جڑواں بھائی مکمل انسان کی شکل تو اختیار نہ کر سکا، تاہم چند اعضا نمایاں طور پر ضرور پروان چڑھے۔ ڈاکٹر اس بچے کے ہاتھ پاؤں اور جبڑا وغیرہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں یقین ہی نہ آیا کہ ایک مرد کے پیٹ میں بچہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ میڈیکل ہسٹری میں درج کیسز کا جائزہ لینے پر انہیں اندازہ ہوا کہ سنجو کے پیٹ میں کوئی بچہ نہیں بلکہ اس کا جڑواں بھائی پل رہا تھا۔

آپریشن کے بعد سنجو کا موٹاپا مکمل طور پر ختم ہو گیا اور ساتھ ہی اس کی جسمانی پیچیدگیاں بھی ختم ہوگئیں۔ سنجو کو اس آپریشن کے بعد سے کبھی سانس لینے میں دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب سنجو کو مستقل تھکن کا سامنا رہتا تھا۔ اس کے پیٹ میں پلنے والا جڑواں بھائی

ایک طرف تو اس کے جسم سے خون کا بڑا حصہ حاصل کر لیتا تھا اور دوسری طرف خوراک میں بھی حصہ دار بنتا تھا۔ ایسی حالت میں سنجو بھلا کس طرح نارمل رہ سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ تھکن اور بیماری کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ جب آپریشن ختم ہو چکا تو یہ تمام پیچیدگیاں بھی ختم ہو گئیں۔ اب سنجو کے لیے نارمل زندگی کی راہ ہموار ہوئی۔ مگر کیا نارمل زندگی اس کے نصیب میں ہے؟

جسمانی طور پر ضرور ہے، نفسیاتی طور پر نہیں۔ بہت سے لوگ اب بھی اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس نے تیس سال اپنے جڑواں بھائی کو پالتے ہوئے گزارے تھے۔ اب اس کے پیٹ میں کچھ نہیں۔ سنجو کو اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ اس کے پیٹ میں پلنے والی چیز دراصل اس کا بھائی تھا۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کے ذریعے جو کچھ (یا جس کسی کو!) اس کے پیٹ سے نکالا اس میں اس کی دلچسپی برائے نام بھی نہ تھی۔ اسے اصلاً صرف اس بات سے غرض تھی کہ لوگ اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھنا چھوڑ دیں۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا۔ اس سے بڑھ کر اس کی کوئی خواہش نہ تھی۔ وہ اس وقت شدید شرمندگی محسوس کرتا تھا جب اس کا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر عورتیں سرگوشیاں کرنے لگتی تھیں۔ بہت سے مرد بھی اسے عجیب نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سنجو کا پھولا ہوا پیٹ ''مردذات'' کے لیے شرمندگی اور ذلت کا باعث بن رہا ہے!

بہت سے لوگ اب بھی سنجو کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ سنجو کے پیٹ میں واقعی کوئی بچہ تھا، اس کا جڑواں بھائی نہ تھا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ سنجو کے پیٹ سے نکالا جانے والا بچہ زندہ ہے اور اسے دنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ سنجو کی صحت بہت اچھی ہے۔ وہ جسمانی طور پر نارمل زندگی گزار رہا ہے مگر نفسیاتی سطح پر اب بھی اس کے لیے کبھی نہ کبھی پیچیدگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ کسی گلی سے گزر رہا ہوتا ہے تو چند ایک فقرے اس پر کس دیے جاتے ہیں۔ مگر اب وہ اس نوعیت کی اذیت ناک باتوں کا عادی ہے۔ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ وہ اس بات سے زیادہ مطمئن ہے کہ اس کے جسم کی تمام پیچیدگیاں ختم ہو چکی ہیں اور وہ بھرپور سانس لے سکتا ہے۔